# عہد نبویؐ میں اسلامی حکومت اور اداروں کی تشکیل

ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن *

**Abstract:**

This article discusses that how the institution were developed in an Islamic state. All that main institutions were in the early stage when the Holy Prophet was alive and under his guidance the in institution were dealing the paradigm principled. This age is very important in the whole history of Islam.

سرزمین مکہ میں انبیاء ورسل کے سلسلے کی آخری کڑی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے دورِ نبوت کا آغاز ہوا..... پہلے خفیہ اور پھر علی الاعلان تبلیغ کا کام جاری تھا۔ محدود تعداد نے حق کی آواز پر لبیک کہی، لیکن عام اہل ملک کی دشمنی اور عملی مخالفت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا، خود آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ کو بڑے صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا۔ مصائب وآلام اور اذیت ناک سزائیں جس طرح روا رکھی گئیں وہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت دردناک باب ہے.....، بظاہر تمام کوششوں کے باوجود یہاں اسلام کے عالمگیر اصولوں کے مطابق مستقل بنیادوں پر اسلامی حکومت کا قیام ممکن نظر نہیں آ رہا تھا..... چنانچہ بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد کچھ صحابہ کرامؓ ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے اور بعد ازاں سیّد دو عالم ﷺ بھی ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور یہیں حضور ﷺ کی قیادت میں پہلی اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

## اسلامی ریاست

اسلام کا مقصد اگرچہ دنیا میں حکومت وسلطنت کا قیام نہیں ہے، لیکن وہ حسن عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے اپنے بندوں سے استخلاف فی الارض کا وعدہ کیا ہے جس کا ذکر اس آیۃ قرآنی میں موجود ہے، ﴿وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ .....الخ﴾۔(۱) اسلام کے احکام وقوانین کا پورا قیام ونفاذ حکومت کے بغیر نہیں ہوسکتا، چنانچہ سیّد دو عالم ﷺ نے مدینہ میں قیام کے بعد ریاست مدینہ کو عملی شکل دینا شروع کر دی جس کی تکمیل خلافت راشدہ کے زمانے میں ہوئی اور عہد رسالت کے سادہ نظام حکومت نے آگے چل کر ایک عظیم الشان حکومت کی شکل اختیار کر لی، جس کا ایک

* ایسوسی ایٹ پروفیسر/مدیر ''فکر ونظر''، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

سرا ہندوستان وچین سے ملتا تھا اور دوسرا جبرالٹر سے۔

کسی ایسی ریاست کو جس میں بسنے والے لوگ مختلف مذاہب، مختلف قبائل اور مختلف نظریات کے حامل ہوں کو کسی ایک دستور کا پابند کیے بغیر مستحکم بنیادوں پر استوار کرنا یا عملی شکل دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ہجرت کے پہلے ہی سال ایک دستور مرتب فرمایا۔ جس میں حکومت، رعایا اور دیگر تمام متعلقات کا تفصیلی ذکر موجود ہے، بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ یہ ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور'' ہے۔(۲) اس دستاویز کی باون دفعات ہیں۔ یہ دستاویز حضور ﷺ کی سیاسی بصیرت اور حکمت عملی کا شاہکار ہے۔ عہد نبویؐ کے نظامِ حکومت کا جائزہ لیتے وقت اس دستاویز کا تفصیلی ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اس کی ایک ایک دفعہ سیاسی تدبر اور ریاست کے استحکام کی مظہر ہے۔

## دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور

مدینہ پہنچنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں بسنے والی اقوام نصاریٰ، یہود اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ قلمبند کرایا جو تاریخ میں ''میثاق مدینہ'' کے نام سے مشہور ہوا اور یہ وہ پہلا تحریری دستور ہے جو آج تک تاریخ کے صفحات میں موجود اور محفوظ ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ لکھتے ہیں: دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور آنحضرت ﷺ نے تحریر کروایا''۔ غرض عام قواعد وقوانین ملک کم وبیش تحریری صورت میں ہر جگہ ملتے ہیں لیکن دستور مملکت کو عام قوانین سے علیحدہ تحریری صورت میں لانا اس کی نظیر باوجود بڑی تلاش کے مجھے عہد نبویؐ سے پہلے نہیں مل سکی۔(۳)

ہجرت کے پہلے ہی سال آنحضرت ﷺ نے یہ نوشتہ مرتب فرمایا۔ اس دستور کی اہمیت کو غیر مسلم مورخین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس دستور کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شروع دور اسلام میں قرآن کے علاوہ کوئی دوسری چیز لکھنے کی ممانعت تھی، لیکن اس دستور کو آنحضرت ﷺ نے خود قلمبند کروایا۔

اس معاہدے کی ہر دفعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے مدبر اور ماہر قانون کا تیار شدہ ہے جو حالات کی جزئیات تک سے کلی طور پر واقف ہو۔ آپؐ مدینہ میں نو وارد تھے اور محض اپنے چند ساتھیوں سمیت تشریف لائے تھے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان تو خیر آپ کے تابع تھے ہی دوسرے قبائل اور یہود نے آپ کی سیاسی بالادستی کو کیسے قبول کر لیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مدینہ میں دو بڑے قبیلے اوس وخزرج اکثر برسرپیکار رہتے تھے۔ اگر ان میں کبھی امن پیدا ہو بھی جاتا تو یہود ان میں نیا فتنہ پیدا کر کے تماشائی کا کردار ادا کرتے اور اس طرح اہل مدینہ پر اپنی بالادستی قائم رکھتے تھے۔ اوس وخزرج کے بعض سمجھدار لوگ یہودیوں کی اس فتنہ پردازی سے نالاں تھے، لیکن ان

کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔کوئی ایسی با اثر شخصیت ان کے سامنے موجود نہ تھی جو یہ فتنہ دبا سکے۔ہجرت سے پہلے ان لوگوں نے حج کے موقع پر آپ ﷺ سے ملاقات کی تو آپ ﷺ کی ذات میں اپنی منزل گم گشتہ نظر آئی۔ چنانچہ آپؐ تشریف لائے تو ان لوگوں نے یہود کے فتنہ اور سیاسی دباؤ سے بچنے کے لیے آپ سے اتحاد و تعاون میں عافیت سمجھی۔ادھر یہود خود ایک وحدت نہ تھے، بلکہ تین بڑے قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔جن کی آپس میں رقابت چلتی تھی۔ چنانچہ میثاق مدینہ کو ان لوگوں نے بیک وقت قبول نہیں کیا۔ یکے بعد دیگرے حالات کے سامنے جوں جوں مجبور ہوتے گئے قبول کرتے گئے۔آپ ﷺ نے میثاق مدینہ میں چونکہ ہر شخص کی مذہبی آزادی اور عدل و انصاف کے ساتھ ہر ایک کے حقوق کو یکساں طور پر تسلیم کیا تھا،لہذا ان لوگوں کے لیے اس دستاویز کو قبول کرنے کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

> ''میثاق مدینہ'' صرف اپنے زمانے ہی میں اہمیت کا حامل نہیں بلکہ آنے والے تمام مسلمان حکمرانوں کے لیے بھی اس میں رہنما اصول مہیا کیے گئے ہیں۔(۴)

معروف مستشرق نکلسن لکھتے ہیں:

> ''بظاہر یہ محتاط اور دانشمندانہ اصطلاح ہے،حقیقت میں یہ ایک انقلاب ہے۔محمد ﷺ نے قبائل کی بے راہ روی پر کھلم کھلا ضرب نہیں لگائی،لیکن اسے ختم کر ڈالا..... ہر چند اس وحدت میں یہودی،مشرکین اور مسلمان شریک تھے لیکن آپ ﷺ اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ اس نوزائیدہ ریاست میں فعال اور با اثر حصہ دار مسلمان ہی ہیں۔ اس حقیقت کو آپ کے مخالفین پہلے نہ دیکھ سکے''۔(۵)

آنحضرت ﷺ نے ریاست کے استحکام کے لیے وہاں کے مروجہ نظام کو ہی اختیار فرمایا۔قبائلی نظام جمہوری نظام کے بہت قریب تھا۔سردار،عمر،علم اور خاندانیت میں افضل ہونے کی بناء پر منتخب کیا جاتا تھا اور وہ قبیلہ کے دیگر افراد کے مقابلے میں First among equal کی حیثیت رکھتا تھا۔آئین مدینہ نے اس نظام کو قبول کیا اور اس طرح علاقائی جمہوریت کا نظام بھی مہیا کیا گیا۔علاقائی جمہوریت سے مراد یہ ہے کہ مرکزی حکومت وفاق پر اپنی will کو مسلط نہیں کرتی۔تاہم کسی وفاقی اکائی کو بادشاہت، جاگیردارانہ نظام یا اشرافیہ،استبدادیت قائم کرنے کی

اجازت نہ تھی۔ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے جمہوریت سے متعلق اسلامی رویہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:
آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جانشینی کا سوال ایک سیاسی ہنگامہ کی شکل میں اٹھا، بات یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ نے اس کا فیصلہ اپنی زندگی میں نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ آپ عربوں کے جمہوری نظام کو پسند فرماتے، اس لیے آپ کو اعتماد تھا کہ مسلمان جمہوریہ طریقہ انتخاب سے ایک شخص کو اپنا حاکم بنالیں گے۔(٦)

## ریاست مدینہ کی تشکیل

جزیرہ نمائے عرب نے اسلام سے پہلے کبھی ایک منظّم حکومت کی شکل اختیار نہیں کی، اس دستاویز کو قبول کرنے کے بعد پہلی مرتبہ یہاں کے باشندگان حضور ﷺ کی سیادت وقیادت میں متحد ہوئے۔ جس ملک میں نراج کا دور دورہ ہو، قبائل عصبیتیں عروج پر ہوں، وہاں ایک مرکزیت قائم کر دینا بلاشبہ یہ حضور ﷺ کا عظیم الشان کارنامہ تھا۔ اس دستور کے ذریعے سے شہر کی حفاظت و مدافعت اور قریش سے مقابلے کا انتظام شروع ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ مدینہ پہنچتے ہی آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلے اپنے بے خانماں ساتھیوں کی رہائش کا انتظام کیا۔ پھر ان مہاجرین اور مدنی مسلمانوں میں ''مؤاخات'' (٧) کے نام سے تنظیم پیدا کر کے ایک شہری مملکت کی بنیاد ڈالی۔ یوں تو تمام امت مسلمہ رشتہ اخوت میں منسلک ہے اور ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ﴾ کا ارشاد اسی حقیقت کا بیان ہے لیکن اس اخوت و یگانگت کا جو عملی مظاہرہ مدینہ طیبہ میں نظر آیا تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر و عاجز ہے، مکہ کے مہاجرین اللہ اور رسول ﷺ کی محبت اور حفاظت دین کے لیے اپنا گھر بار، مال ومتاع سب کچھ چھوڑ کر مدینہ پہنچ گئے۔ ظاہر ہے کہ نئی جگہ انہیں معاشی مسئلہ درپیش تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندوں سے انہیں کوئی خاص شناسائی بھی حاصل نہیں تھی، سرور دو عالم ﷺ نے حکیمانہ تدبر اور حکمت عملی سے اس گتھی کو یوں سلجھایا کہ بیگانگی کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہا، آپ نے ایک مہاجر اور ایک انصار کو بھائی بنا دیا۔ سرور عالم ﷺ کی زبان مبارک نے جن دو صحابیوں کو رشتہ اخوت میں منسلک کیا ان کی اخوت و یگانگت سگے بھائیوں کی محبت سے بڑھ گئی۔ انصار نے ایثار وقربانی کا وہ حیرت انگیز نمونہ پیش کیا جو صفحات تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہے گا۔ انہوں نے مہاجرین کو مال و دولت، زمین و جائیداد اور کھیتی باڑی میں برابر کا شریک کر لیا۔(٨)

انصار کی فراخدلانہ محبت اور اتباع رسول کا اندازہ اس سے کیجئے کہ عبدالرحمان بن عوف کی مؤاخات سعد بن ربیع کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ عبدالرحمٰن کو اپنے گھر لے گئے اور کہا کہ اس تمام مال واسباب میں نصف آپ کا ہے اسے قبول کیجئے اور سنیے میری دو بیویاں ہیں، آپ جس کو پسند کریں میں اسے طلاق دے دوں گا اس سے آپ نکاح کر

لیجئے۔(۹) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے مال وعیال میں اللہ برکت دے مجھے تو بازار کا راستہ بتا دیجئے۔ سرورِ عالم ﷺ کی اس حکمت عملی اور سیاسی تدبر سے جہاں مہاجرین کا معاشی مسئلہ حل ہو گیا وہاں مدینہ کی شہری مملکت کے استحکام کا بھی پہلا مضبوط پتھر رکھ دیا گیا، شہر میں اب مہاجرین مکہ، مدنی مسلمان، ان کے رشتہ دار، غیر مسلم عرب اور یہودی قبائل تھے اور میثاق مدینہ کی رو سے یہ سب حضور ﷺ کی سیادت پر متفق اور آپؐ کی سرداری میں ایک مرکز پر جمع تھے، یوں حضور ﷺ نے وفاقی شہری مملکت کی بنیاد ڈالی۔ رشتہ مواخات بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لیے قائم کیا گیا تھا، لیکن حقیقت میں اس طرح انصار کو مہاجرین کے ایک ایسے گروہ کی تربیت میں دے دیا گیا تھا جو شرف صحبت کی برکت سے قابلیت اور صلاحیت کے بلند مرتبے پر فائز تھا، نیز بقول مولانا مناظر احسن گیلانی:

> ''اب قومیت اور نسلیت کا بت سامنے آتا ہے..... مہاجرین قریش اور قریشی نسل کے ساہوکار کعبہ کے کلید بردار تھے اور انصار قبیلہ اوس وخزرج کے کسان اور کاشتکار تھے..... قریش کو اپنے نسب پر اپنے حسب پر بڑا ناز تھا..... غیر قریشی عربوں کے ساتھ حج کرنے میں بھی اپنی اہانت محسوس کرتے تھے۔ یہ مواخات کا گرز تھا جس نے اس بت کو بھی ڈھیر کر کے رکھ دیا''۔(۱۰)

اسلامی حکومت کے قیام یعنی قوانین الٰہیہ کے مکمل نفاذ کے لیے سرکارِ مدینہ ﷺ کو میدانِ کارزار میں دشمنانِ اسلام سے نبرد آزما بھی ہونا پڑا۔ حضورؐ کی زندگی کا یہ پہلو بھی اپنا انفرادی اور امتیازی مقام رکھتا ہے۔ آپ کی زندگی مقدسہ کے اس پہلو پر اہل علم نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

''الرسول القائد'' کے مصنف لکھتے ہیں:

> ''سیرت سے متعلق بہت سی کتابوں کا میں نے امعان نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی حیاتِ عسکری مجھے بہت زیادہ گراں بہا اور گراں مایہ نظر آئی، تاریخ حربیات میں آپ کا مقام قدیم وجدید تمام سپہ سالاروں اور امیرانِ عساکر سے کہیں زیادہ بلند وبالا ہے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ آپ کی حیاتِ عسکری کے لازوال اور غیر فانی پہلوؤں کو اب تک اُجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی..... آپؐ کی حیاتِ طیبہ کا یہ پہلو جو حد درجہ عظیم

اور وقیع ہے، چشم دنیا سے ابھی تک پنہاں ہے یا کم از کم اپنے اصل آب و رنگ کے ساتھ نظروں کے سامنے نہیں آیا''۔(۱۱)

حضورﷺ کی زندگی کے عسکری پہلو پر نظر ڈالیں تو تین باتیں نمایاں نظر آتی ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ آپ حد درجہ بلند ہمت اور صاحب عزم وثبات قائد افواج تھے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ آپ کی ساری جنگیں، حمایت حریت عامہ، نشر اسلام اور ارکان اسلام کی صیانت وحفاظت کے لیے تھیں، نہ کہ اعتصاب واستقلال، ظلم وجور، قتل وغارت اور بندگانِ خدا کی غلامی کے لیے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ بالعموم تمام سپہ سالاروں کو اپنی قوم کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہوتی تھی، جب کہ آپ کو ایک نئی قوم کی تشکیل کرنا پڑی جس کے اجزاء مختلف مقالات سے حاصل کیے گئے تھے۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسانی جان بہت زیادہ محترم ہے۔ ناگزیر اسباب ووجوہ کے بغیر انسانی جان کی حفاظت کو ہر حال میں لازم قرار دیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ تَعَالَوْاْ أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُواْ بِهِ شَيْئاً وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَلاَ تَقْتُلُواْ أَوْلاَدَكُم مِّنْ إِمْلاَقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلاَ تَقْرَبُواْ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلاَ تَقْتُلُواْ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّهُ إِلاَّ بِالْحَقِّ ذَلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾

(ترجمہ): اے محمد! کہو کہ آؤ! میں تم کو بتاؤں کہ اللہ نے تم پر کیا کیا حرام کیا ہے۔ تم پر واجب ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، والدین سے نیک سلوک کرو۔ اپنی اولاد کو مفلسی اور تنگدستی کے باعث قتل نہ کرو، ہم جہاں تم کو رزق دیتے ہیں ان کو بھی دیں گے، بدکاریوں کے قریب بھی نہ بھٹکو خواہ وہ چھپی ہوئی ہوں یا کھلی، کسی ایسی جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے ہلاک نہ کرو، سوائے اس صورت میں کہ ایسا کرنا حق کا تقاضا ہو۔ اللہ نے ان باتوں کی تمہیں تاکید کی ہے شاید تم کو کچھ عقل آئے۔

سیّد دو عالمﷺ نے ہمیشہ انسانی جان کے احترام کی تلقین کی ہے۔ صرف دو مثالیں پیش خدمت ہیں:

''انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا، بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شریک کرنا ہے، پھر قتل نفس، پھر والدین کی نافرمانی کرنا اور پھر جھوٹ بولنا''۔(۱۳)

ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن اپنے دین کی وسعت میں اس وقت تک برابر رہتا ہے جب تک وہ کسی حرام خون کو نہیں بہاتا۔

انسانی معاشرت میں سب سے مقدم اور مقدس شئے انسان کی جان ہے، دنیا کے تمام مہذب قوانین اور شریعتوں میں احترام نفس کا یہ اصول موجود رہا ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر انسانی معاشرت منظّم ہوتی ہے۔ ہوس، جاہ و زر، لسانی اور نسلی تعصّبات کی خاطر انسانی خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگین کرنا بلاشبہ ایک قبیح فعل ہے، بعثت نبوی ﷺ سے پہلے کی جاہلی تاریخ میں آپ کو یہی کچھ نظر آئے گا۔ آنحضرت ﷺ نے فکر انسانی کو نیا رخ دیا۔ انسان کا مرنا اور جینا اللہ کے لیے قرار دیا اور اس فکر و عقیدہ کی آبیاری کی کہ مومن کی تلوار صرف اور صرف اعلائے کلمۃ الحق کے لیے بے نیام ہوسکتی ہے۔ بے شک جب انسانی جان کا احترام اٹھ جائے، انسانی حقوق پامال ہو رہے ہوں، مخلوق خدا سے باغی ہو جائے تو ایسی حالت میں جنگ جائز ہی نہیں فرض ہو جاتی ہے۔ اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوتی ہے کہ ان ظالموں کے خون سے زمین کو سرخ کر دیا جائے اور ان مفسدوں اور فتنہ پردازوں کے شر سے اللہ تعالیٰ کے مظلوم و بے بس بندوں کو نجات دلائی جائے جو شیطان کی امت بن کر اولاد آدم پر اخلاقی روحانی اور مادی تباہی کی مصیبتیں نازل کرتے ہیں۔ گویا اسلامی نقطہ نظر سے بقول مصنف الرسول القائد:

> ''جنگ صرف اس صورت میں جائز ہے کہ وہ دعوت اسلام کی آزادی اور امن و امان برقرار رکھنے کے لیے لڑی جائے اور دوران قتل شجاعت و شرافت کے اصولوں کی مراعات ملحوظ خاطر رکھی جائیں''۔(۱۵)

سیّد دو عالم ﷺ کو ریاست مدینہ کے استحکام کے ضمن میں یہودیوں کی طرف سے کی جانے والی سازشوں سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا اور صلح حدیبیہ کے بظاہر تلخ مرحلے کو بھی سر کرنا پڑا۔

صلح حدیبیہ سے تھوڑا سا پہلے کے حالات پر نظر ڈالیں تو ایک اور اہم واقعہ بھی نظر آئے گا جس کی آئندہ پیش آمدہ حالات بالخصوص صلح حدیبیہ کے ضمن میں خصوصی اہمیت ہے۔ بنی قینقاع اور بنی النضیر کے یہودی مضافات مدینہ سے جلاوطنی پر مجبور ہوئے تو وہ مدینہ کے شمال میں خیبر وغیرہ کی یہودی بستیوں میں آباد ہونا شروع ہو گئے اور یوں اب یہ مقامات مسلمانوں کے خلاف سازش کے اڈے بن گئے۔ یہ زمانہ مسلمانوں کے لیے خاصا کٹھن تھا، شمال میں خیبر وغیرہ یہودی قوت کے مرکز تھے۔ شمال مشرق میں فزارہ و غطفان کے قبائل خیبر والوں کے حلیف تھے اور ان کی مسلمانوں سے بنتی نہ تھی اور جب موقع ملتا یہ مسلمان آبادی کو برباد کرنے کے درپے رہتے تھے۔ جنوب میں مکہ تھا،

جس کی قوت چاہے معاشی طور پر متاثر ہوئی ہو جنگی حیثیت سے برقرار تھی۔ اب آثار یہ نظر آ رہے تھے کہ جلاوطنان مدینہ کے خلاف کارروائی کریں گے۔ اس تناظر میں جب آپ صلح حدیبیہ اور اس کی شرائط پر غور کریں تو یہ معاہدہ آنحضرت ﷺ کی سیاست خارجہ کا شاہکار نظر آتا ہے۔

اس معاہدے پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کمال حکمت عملی سے اس معاہدہ میں باندھ کر ان تینوں فریقوں کو اس بات کا پابند بنا دیا کہ وہ مسلم ریاست پر متحد حملہ آور نہ ہوں۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں:

> ''حدیبیہ میں قریش کو یہودیوں کے متعلق غیر جانبدار رہنے پر آمادہ کر دینا وہ زبردست سیاسی اور سفارتی (ڈپلومیٹک) کامیابی تھی کہ اس کے متعلق قرآن مجید کا دیا ہوا نام ''فتح مبین'' ذرہ بھی مبالغہ آمیز نظر نہیں آتا ہے''۔(۱۶)

معاہدہ حدیبیہ میں عرب کے دیگر قبائل کو اپنی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ جس کا حلیف بننا چاہیں بن جائیں۔ معاہدہ حدیبیہ کی رو سے ان میں سے کسی کو بھی دوسرے پر ہاتھ اٹھانے کا حق نہ تھا لیکن قریش اور اس کے حلیف قبیلہ نے معاہدہ کی پاسداری نہ کی۔ بنو بکر نے خزاعہ کے آدمیوں پر حملہ کیا۔ انہوں نے حرم میں پناہ لینا چاہی مگر وہاں بھی خون بہایا گیا، اس حملے میں قریش نے اپنے حلیف قبیلہ کی اسلحہ و افراد کے ساتھ مدد کی۔ اس صورت حال کی اطلاع دینے کے لیے خزاعہ کا ایک وفد بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوا اور جملہ حالات بیان کیے۔ آنحضرت ﷺ کو قریش کی طرف سے یہ بدعہدی بہت ناگوار گزری اور آنحضرت ﷺ نے ایک قاصد کو مکہ روانہ کیا اور حسب ذیل تین شرطیں پیش کیں اور قریش کو اختیار دیا کہ ان میں سے جون سی شرط چاہیں قبول کر لیں۔

۱۔ مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔

۲۔ قریش، بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔

۳۔ معاہدہ حدیبیہ کے ٹوٹ جانے کا اعلان کر دیا جائے۔

آنحضرت ﷺ کے قاصد نے جب یہ تین شرائط مکہ والوں کے سامنے پیش کیں تو ان میں سے قرطہ بن عمر نے جواب میں کہا کہ ہمیں تیسری شرط منظور ہے۔ گویا معاہدہ حدیبیہ فسخ کرنے کا اعلان کر دیا جائے۔ یہ جواب پا کر آنحضرت ﷺ کا قاصد عازم مدینہ ہو گیا تو قریش کو خیال آیا کہ ہم نے کیا کیا؟ انہیں اپنے جواب پر بہت پچھتاوا ہوا۔ تلافی اور تجدید معاہدہ کے لیے ابوسفیان مدینہ طیبہ پہنچا، آنحضرت ﷺ نے تجدید معاشہدہ سے صاف انکار کر دیا۔ ابوسفیان کے واپس جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام کو جنگی تیاریوں کا حکم دیا مگر ساتھ ان تیاریوں کو

مخفی رکھنے کا حکم بھی دیا۔ ایک صحابی حاطب بن ابی بلتعہ نے مکہ والوں کو خبر دار کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں ایک خط مکہ جانے والی ایک خاتون کے سپرد کیا جو بعض قریشی سرداروں کے نام تھا، خط کا مضمون حسب ذیل تھا:

> ''اے گروہ قریش! رسول اللہ ﷺ رات کی مانند تم پر ایک ہولناک لشکر لے کر آنے والے ہیں جو سیلاب کی طرح بہتا ہوگا، خدا کی قسم اگر رسول اللہ ﷺ بلا لشکر کے خود تن تنہا بھی تشریف لے جائیں تو اللہ تعالیٰ ضرور آپ کی مدد فرمائے گا اور فتح و نصرت کا جو وعدہ خدا نے آپ سے کیا ہے وہ ضرور پورا کرے گا''۔(۱۷)

آنحضرت ﷺ کے حکم سے حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ اس عورت کے تعاقب میں روانہ ہوئے اور راستے میں جا لیا، اس عورت نے یہ خط اپنے بالوں میں چھپا رکھا تھا۔ آنحضرتؐ نے خط کی وصولی کے بعد حاطب بن ابی بلتعہ کو طلب فرمایا اور پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ حاطب نے عرض کیا ''یارسول اللہ! آپ مواخذہ میں عجلت نہ فرمائیں'' یارسول اللہ! قریش سے میری کوئی قرابت نہیں، فقط حلیفانہ تعلقات ہیں۔ میرے اہل وعیال آج کل مکہ میں ہیں جن کا کوئی مددگار نہیں۔ بخلاف مہاجرین کے کہ مکہ میں ان کی قرابتیں ہیں، قرابتوں کی وجہ سے ان کے اہل وعیال محفوظ ہیں، اس لیے میں نے چاہا کہ جب قریش سے میری کوئی قرابت نہیں تو ان کے ساتھ کوئی احسان کروں جس کے صلے میں وہ میرے اہل وعیال کی حفاظت کریں۔ خدا کی قسم میں نے دین سے مرتد ہو کر اور اسلام کے بعد کفر سے راضی ہو کر ہرگز یہ کام نہیں کیا۔ میری غرض فقط وہی تھی جو میں نے عرض کی''۔(۱۸) آنحضرت ﷺ نے حقیقت حال بیان کر دینے پر حاطب کو معاف فرما دیا۔

رمضان ۸ ہجری کو آپ ﷺ کی قیادت میں دس ہزار جاں نثاروں کا لشکر مکہ روانہ ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے انتہائی رازدارانہ طریقے سے یہ سفر کیا۔ مکہ سے ایک منزل دور مرالظہران پر پہنچ کر آنحضرت ﷺ نے آگ روشن کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ابوسفیان، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء صورت حال معلوم کرنے کے لیے آئے۔ ابو سفیان پر حضرت عباسؓ کی نظر پڑ گئی اور وہ اسے حضور ﷺ کی بارگاہ میں لے آئے۔ حضرت عمرؓ نے ابوسفیان کو دیکھا تو بے قابو ہو گئے، حضور ﷺ سے اجازت چاہی کہ ابوسفیان کا سر قلم کر دیا جائے مگر حضرت عباسؓ کی سفارش پر آپ ﷺ نے ابوسفیان کو معاف فرما دیا۔

لشکر اسلام جب مکہ کی جانب بڑھا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ وہ ابوسفیان کو لے کر

کسی بلند جگہ کھڑے ہو جائیں تا کہ ابوسفیان افواج اسلام کا نظارہ کر سکے۔ ابوسفیان بلندی پر کھڑا عرب کے مختلف قبائل پر مشتمل اس بحر بیکراں کو مکہ کی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ وہ لوگ اس کے سامنے سے گزر رہے تھے جو اسی مکہ سے بے گھر ہو کر نکلے تھے جن پر تشدد کی شہادت مکہ کے سنگریزے بھی دے رہے تھے۔ مکہ کی گرم ریت پر لیٹ کر احد احد کے نعرے بلند کرنے والے بلال آج لشکر اسلام میں موجود تھے۔ دس برس کی شبانہ روز جسمانی اور روحانی کاوشوں کے بعد مکہ کا جلاوطن آج فاتحانہ انداز میں مکہ میں داخل ہو رہا تھا۔ آج سے دس سال پہلے جب اس نے اس سرزمین سے ہجرت کی تو ایک رفیق ہجرت ساتھ تھا۔ آج دس ہزار سے زائد قدسی صفت جاں نثار اس کے ساتھ تھے لیکن آنحضرت ﷺ کا مکہ میں داخلہ کسی جبار فاتح کی طرح نہیں تھا آپ کا یہ فاتحانہ داخلہ نبی اور ایک بادشاہ کے داخلے میں فرق کو نمایاں کر رہا تھا۔ آپ عجز و انکسار کے ساتھ حرم میں جب داخل ہوئے تو انکسار سے گردن اس قدر جھکی ہوئی تھی کہ ریش مبارک کجاوہ کی لکڑی سے مس کر رہی تھی، اس موقع پر آپ نے درج ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

> ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کیا۔ اپنے بندے کی امداد کی اور سارے گروہوں کو اکیلے ہی شکست دی۔ خبردار! ہر قسم کا خواہ وہ خون کا مطالبہ ہو یا مال کا وہ میرے ان پاؤں کے نیچے ہے۔ البتہ بیت اللہ کی دربانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کی زحمت کے مناصب جوں کے توں ہیں۔ اے گروہ قریش! آج کے دن اللہ نے تم سے جاہلیت کا غرور لیا اور آباء و اجداد کے بل پر بڑھائی غلط قرار دے دی، سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنا ہے''۔(۱۹)

اکابر قریش اور دیگر لوگ آنحضرت ﷺ کے سامنے موجود تھے۔ ان کا اپنا کیا انہیں یاد تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ابھی جاں نثاران مصطفیٰ آپ کا اشارہ پاتے ہی ان کے جسم و روح کے رشتے کو منقطع کر دیں گے لیکن رحمۃ للعالمین کی زبان وحی ترجمان حرکت میں آتی ہے اور یہ الفاظ ادا ہوتے ہیں:

﴿لَاتَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اِذْهَبُوا، فَاَنْتُمُ الطُّلَقَا﴾(۲۰)

آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

اس عفو عام میں سے آٹھ آدمیوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا اور ان کے خون کو مباح قرار دیا گیا تھا۔ یہ آٹھ افراد حسب ذیل ہیں:

(۱) عبداللہ بن خطل، (۲،۳) قرتنی اور قریبہ (دونوں لونڈیاں تھیں)، (۴) حویرث، (۵) مقیس بن صبابہ، (۶) عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، (۷) سارہ، (۸) عکرمہ بن ابی جہل۔

عبداللہ بن خطل کو قتل کر دیا گیا۔ قرتنی اور قریبہ میں سے ایک ماری گئی اور دوسری کی درخواست پر اسے معاف کر دیا گیا۔ سارہ قتل کر دی گئی۔ مقیس بن صبابہ اور حویرث کو بھی قتل کر دیا گیا۔ عبداللہ بن ابی سرح کو حضرت عثمان کی سفارش پر اور عکرمہ کو اس کی اپنی درخواست پر معاف کر دیا گیا۔

فتح مکہ کے بعد قبائل جوق در جوق حلقہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ عمرو بن سلمہ مشہور صحابی کا کہنا ہے: عرب قریش کے قبول اسلام کا انتظار کر رہے تھے، وہ کہتے تھے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو ان کی قوم پر چھوڑ دو، اگر محمدؐ ان پر غالب آ گئے تو بلاشبہ وہ سچے پیغمبر ہیں، پس جب مکہ فتح ہوا تو ہر قبیلہ نے اسلام کی طرف پیش قدمی کی۔

فتح مکہ نے مشرکین کی کمر توڑ دی تھی مگر تا حال دو قبیلے ہوازن اور ثقیف اپنی طاقت پر نازاں تھے۔ انہیں اپنی جنگی مہارت پر بڑا اعتماد تھا، ان کا کہنا تھا کہ اہل اسلام کو اب تک جن قبائل سے واسطہ پڑا ہے وہ مرد میدان نہ تھے۔ اب جب ہمارے ساتھ مقابلہ ہوگا تو انہیں معلوم ہو جائے گا۔

آپ ﷺ بارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ حنین کی جانب بڑھے، اس سے پہلے کبھی مسلمانوں کی اتنی بڑی جمعیت کسی غزوہ میں شریک نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ بعض صحابہ کرام کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ آج ہم پر کون غالب آ سکتا ہے، عام حالات میں یہ جملہ کوئی قابل گرفت جملہ نہیں ہے مگر وہ قدسی صفت علمبر داران توحید جنہوں نے بارگاہ مصطفیٰ ﷺ میں توحید کا درس پڑھا تھا، جنہوں نے معرکہ بدر میں مٹھی بھر جماعت کو ایک لشکر جرار پر غالب آتے دیکھا، ان کی زبان پر کثرت تعداد کا یہ فخریہ جملہ آیا تو بارگاہ الٰہی میں ناگوار گزرا۔ چنانچہ پہلے حملے میں تو مشرکین پسپا ہوئے لیکن پلٹ کر جو حملہ کیا تو مسلم فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ''تیروں کا مینہ برس رہا تھا، بارہ ہزار فوجیں ہوا ہو گئیں تھیں لیکن ایک پیکر مقدس پا برجا تھا، جو تنہا ایک فوج ایک ملک ایک اقلیم ایک عالم بلکہ مقصود کائنات تھا (ﷺ)''۔ (۲۱)

سرور عالم ﷺ نے یہ کیفیت دیکھی تو بلند آواز میں پکارا ''یا معشر الانصار'' (اے انصار کے لوگو) جواب میں آواز آئی، یا رسول اللہ ﷺ ہم حاضر ہیں۔ آپؐ اپنی سواری سے اتر پڑے اور جلال سے ارشاد فرمایا:

انا النبی لا کذب  انا ابن عبدالمطلب (۲۲)

میں پیغمبر ہوں یہ جھوٹ نہیں ہے۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

حضرت عباسؓ نے بلند آواز سے مہاجرین وانصار کو پکارا، ان کی آواز سنتے ہی مسلمان پلٹ پڑے اور پھر بدر واحد کے غازی اس سرفروشی کے ساتھ لڑے کہ کفار کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ غزوہ حنین کا تذکرہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں مذکور ہے۔

**و یوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئا وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولّیتم مدبرین. ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ و علی المؤمنین وانزل جنود الم تروھا و عذّب الذین کفروا و ذالک جزآء الکافرین.** (۲۳)

(ترجمہ) اور حنین کے دن جب کہ تمہاری کثرت نے تم کو خود پسندی میں ڈال دیا، پس وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود وسیع ہونے کے تم پر تنگ ہوگئی اور پھر تم پشت پھیر کر بھاگے، اس کے بعد اللہ نے خاص تسکین اتاری اپنے رسول ﷺ پر اور اہل ایمان کے قلوب پر اور ایسے لشکر اتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو سزا دی اور یہی سزا ہے کافروں کی۔

حنین میں کفار کی شکست خوردہ فوج کا کچھ حصہ طائف میں اور کچھ اوطاس میں جمع ہوگیا۔ اوطاس والوں کی خبر گیری کے لیے آپ نے ابوموسیٰ اشعری کو ایک چھوٹی سی فوجی جماعت کے ساتھ روانہ کیا۔ لشکر کفار کا رئیس در بدقتل ہوا اور فوج بھاگ نکلی، طائف کا بنفس نفیس آپ ﷺ نے محاصرہ کیا، محاصرہ بیس روز تک جاری رہا۔ اس اثناء میں طائف کے گردونواح کے لوگوں کی اکثریت حلقہ اسلام میں داخل ہوگئی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے بے فکر ہوکر محاصرہ اٹھا لیا۔

۹ھ میں آنحضرت ﷺ کو اطلاع ملی کہ شام میں مسلمانوں سے جنگ کے لیے ایک زبردست فوج تیار کی جا رہی ہے اور ہرقل نے بھی چالیس ہزار کا ایک لشکر جرار بغرض تعاون روم سے روانہ کر دیا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے پیش قدمی کا فیصلہ فرمایا۔ رجب ۹ھ کو آنحضرت ﷺ انیس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ شام کی جانب روانہ ہوئے۔ حضرت علیؓ کو مدینہ میں چھوڑا گیا۔ تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ حملے کی خبر غلط تھی، تاہم بیس روز تک آپ ﷺ نے تبوک میں قیام فرمایا۔ آپ کی اس بروقت پیش قدمی اور تبوک میں قیام نے شامیوں کے حوصلے بہت پست کر دیئے۔ تبوک کی مہم سے عصبیت جاہلیہ اور کفر وشرک کی تحریک بھی بری طرح متاثر ہوئی۔ اس کا مستقبل تاریک ہوگیا

اور مولانا مودودی کے الفاظ میں:

''تبوک کی بلا جنگ فتح نے عرب میں ان لوگوں کی کمر توڑ دی جو اب تک جاہلیت قدیمہ کے بحال ہونے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ خواہ اعلانیہ مشرک ہوں ی اسلام کے پردے میں منافق بنے ہوئے ہوں۔ اس آخری مایوسی نے ان میں سے اکثر و بیشتر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہنے دیا کہ اسلام کے دامن میں پناہ لیں اور اگر خود نعمت ایمانی سے بہرہ ور نہ بھی ہوں تو کم از کم آئندہ نسلیں بالکل اسلام میں جذب ہو جائیں۔ اس کے بعد ایک برائے نام اقلیت شرک و جاہلیت میں ثابت قدم رہ گئی۔ وہ اتنی بے بس ہو گئی تھی کہ اس اصلاحی انقلاب کی تکمیل میں کچھ بھی مانع نہ ہو سکتی تھی۔ جس کے لیے اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو بھیجا تھا''۔ (۲۴)

اس کے بعد سیرت نبوی ﷺ کا سب سے اہم واقعہ ''حجۃ الوداع'' ہے۔ لیکن ہم اس سے پہلے سیرت نبوی کے سیاسی پہلو کا ایک ہلکا سا تجزیہ پیش کر دینا چاہتے ہیں تا کہ معلوم ہو کہ کس فہم وفراست، کمال تدبر اور حکمت عملی سے آپ ﷺ نے اتنا عظیم الشان انقلاب برپا کیا۔

اس ضمن میں سب سے اہم اور ضروری بات جو پیش نظر رکھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں اس مشن اور مقصد کو دیکھنا چاہیے جس کے لیے آنحضرت ﷺ کو ان کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا، جنگیں لڑیں، صلح کی، معاہدے کیے، الغرض پوری زندگی ہر دم متحرک رہے۔ ایک نبی کی حیثیت سے آپ کا پہلا فرض منصبی تھا کہ آپ دعوت الی اللہ کو لوگوں تک پہنچائیں۔ حق پرستوں پر مشتمل ایک امت مسلمہ تشکیل دیں۔ اس امت کو دستورِ حیات کے طور پر اللہ کا عطا کردہ نظام ''دین اسلام'' سپرد کریں، اس کے تمدن کی اساس قرآن وسنت پر ہو، اس کے لیے منبع رشد و ہدایت اللہ اور اس کا رسول ہوں۔ یہ امت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے اور ساری دنیا کی رہنمائی کا سامان کرے۔ مختصر ترین الفاظ میں یہ تھا وہ عظیم الشان مقصد اور مشن جس کے حصول کے لیے رسول اللہ ﷺ نے تیئس سال کی جاں گسل جدوجہد کی، دنیا بھر کی باطل قوتوں سے پنجہ آزمائی کی اور ہر طرح کی تکالیف کو برداشت کیا۔ اس ضمن میں حضور علیہ السلام کا طریقہ کار اور مخالفین اسلام کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ ایک فاتح کی بجائے ایک داعی اور مبلّغ کا تھا، آپ کی تمام جنگوں اور مدبرانہ اقدامات میں ایک جنگجو کمانڈر کے بجائے ایک معلم کی رحمدلانہ شان پائی

جاتی ہے۔

ہجرت کے بعد مدینہ تشریف آوری کے دوسال کے اندر اندر حضور علیہ السلام نے مدینہ کے آس پاس قیام پذیر قبائل سے بہت سے سیاسی معاہدے کیے۔ کچھ قبائل سے باقاعدہ دفاعی معاہدے بھی عمل میں آئے جن میں طے پایا کہ مسلمان اور وہ قبائل بیرونی حملوں کی صورت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے، بعض قبائل کے ساتھ صرف اتنی بات پر سمجھوتہ ہوا کہ وہ اعدائے اسلام کے ساتھ کسی نوعیت کا تعلق نہ رکھیں گے، کچھ قبائل سے یہ بھی طے پایا کہ اگر مسلمانوں پر کسی طرف سے حملہ ہوا تو وہ غیر جانبدار رہیں گے۔ بعد میں بھی آپ کی یہ ایک مستقل پالیسی رہی کہ حلیفانہ تعلقات کو زیادہ سے زیادہ توسیع دی جائے اور حلیفانہ تعلقات کی اس پالیسی سے ریاست مدینہ نہایت مستحکم ہوگئی اور اس سے ٹکر لینا مشکل ہوگیا۔ ان تمام اقدامات کا نتیجہ دیکھئے جب آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی تو مسلمانوں کی کل تعداد تقریباً ساڑھے چھ سو تھی۔ مدینہ میں تقریباً دوسو، مکہ میں چار سو تیس پینتیس کے لگ بھگ اور حبشہ میں کم وبیش سو مسلمان تھے۔ ہجرت کے بعد پہلی عید کے موقع پر ۲ھ میں جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں مردم شماری کرائی تو سات سو کے قریب مرد تھے، اتنی ہی عورتیں فرض کر لی جائیں تو ۲ھ میں دنیا بھر میں کل مسلمان زیادہ سے زیادہ دو ہزار بنتے ہیں۔ یہ تھی وہ افرادی قوت جس کو ساتھ لے کر حضور ﷺ نے کام شروع کیا۔ قیام مدینہ کے دوران حضور ﷺ نے کل سترہ غزوات میں حصہ لیا۔ ۲۲ سرایا تھے، تقریباً ۸۸ گشتی دستے وقتاً فوقتاً ارسال فرمائے، دوسو نو وفود کو باریاب فرمایا۔ مختلف قبائل عرب سے معاہدے کیے۔ (جن کی تعداد شاید ۲۵-۳۰) بنی ہے، سو کے قریب تبلیغی وسیاسی سفراء بھیجے۔ بے شمار تبلیغی وسیاسی خطوط لکھے۔ جن میں تقریباً چار سو خطوط کے متن تو اب تک دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً تین سو قبائلی سرداروں سے بیعت لی۔ نتیجۃً جب آپ حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے تو ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ فرزندانِ اسلام ہمرکاب تھے۔ جب وفات طیبہ ہوئی تو ساڑھے نو لاکھ مربع میل پر اسلامی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا اور قریب قریب دس لاکھ افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ لیکن اس ساری مہم میں چودہ سو افراد کا خون بہا۔ سارے غزوات وسرایا میں چار سو سے کچھ کم ہی صحابہؓ نے جام شہادت نوش کیا اور نو سو سے کچھ زائد کافر مارے گئے۔ (۲۵)

اب اس تناظر میں جب ہم خطبہ حجۃ الوداع کی جزئیات پر نگاہ ڈالیں گے تو فکر اسلامی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ یہ انقلاب عملی شکل میں بھی اپنی انتہا کو سر کرتا ہوا نظر آئے گا۔

خطبہ حجۃ الوداع

حجۃ الوداع کو سیرت نبوی ﷺ میں نہایت اہم حیثیت حاصل ہے، اس لیے کہ اس پہلے اور آخری حج کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے ایک انقلاب آفرین خطبہ ارشاد فرمایا۔ بلاشبہ یہ خطبہ اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ ذیل میں ہم اس خطبہ کا اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:۔

لوگو! میری بات غور سے سنو، میرا خیال ہے کہ شاید اس سال کے بعد اس جگہ پر تم سے نہ مل سکوں اور نہ شاید اس سال کے بعد (آئندہ) حج کر سکوں۔

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے بہت سے خاندان اور قبیلے بنا دیئے، تاکہ تم پہچانے جا سکو، یعنی باہم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو اور خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی برتری نہیں ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر، اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے۔ فضیلت اور برتری صرف پرہیزگاری کی بناء پر ہے۔

سب لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔ خبردار! خون یا مال کا ہر وہ دعوی جس کے لوگ مدعی ہیں وہ میرے قدموں تلے ہے۔ (میں اسے باطل قرار دیتا ہوں) مگر بیت اللہ کی نگرانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت حسب دستور رہے گی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا۔

اے گروہ قریش! قیامت کے دن ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کا بوجھ اپنی گردنوں پر اٹھائے ہوئے آؤ اور لوگ آخرت کا سامان لے کر آئیں۔ (یاد رکھو) اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکوں گا۔

خبردار! زمانہ جاہلیت (قبل از اسلام) کی تمام رسمیں میرے قدموں کے نیچے روندی گئی ہیں، زمانہ جاہلیت کے تمام خون (خواہ وہ کسی کے بھی ہوں) سب معاف ہیں، اس سلسلے میں سب سے پہلے اپنے ہی خاندان کا ایک خون جو کہ ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا ہے، معاف کرتا ہوں۔

لوگو! تمہارے اموال اور تمہاری عزت و آبرو قیامت تک ایک دوسرے پر حرام ہیں جس طرح تمہارے پر اس دن، اس مہینے اور اس شہر کی حرمت واجب ہے اور تم سب عنقریب اپنے پروردگار سے جا ملو گے جہاں تم سے تمہارے اعمال کا محاسبہ ہوگا۔

اے لوگو! تمہاری عورتوں پر تمہارے کچھ حقوق ہیں اور اسی طرح تم پر تمہاری عورتوں کے حقوق ہیں۔ تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی کو تمہارے بستر پر نہ بیٹھنے دیں جسے تم پسند نہ کرتے ہو نیز ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ کھلی بے حیائی کا کوئی کام نہ کریں، لیکن اگر وہ ایسا کریں تو تمہارے رب نے تمہیں یہ اجازت دی ہے کہ ان کے

سونے کی جگہ اپنے سے الگ کردو، (اگر اس پر بھی باز نہ آئیں) پھر تمہیں اجازت ہے کہ ایسی ہلکی مار مارو جس سے بدن پر نشان نہ پڑیں اور اگر وہ اپنی نازیبا حرکتوں سے باز آ جائیں تو حسب دستور ان کا کھانا اور کپڑے تمہارے ذمے ہیں۔

خبردار! کسی عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ دے، عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کے لیے ہمیشہ پابند رہو، کیونکہ وہ تمہاری زیر نگرانی ہیں، اور اس حیثیت میں نہیں کہ اپنے معاملات خود چلا سکیں۔ عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ تم نے ان کو اللہ تعالیٰ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور اللہ کے کلمات کے ذریعے ان کو اپنے لیے جائز و حلال کیا ہے۔

لوگو! اللہ تعالیٰ نے (میراث کا قانون نازل کر کے) ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے اس لیے اب کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت جائز و نافذ نہیں، بچے کا نسب اسی مرد سے ثابت ہوگا جس کی وہ بیوی ہے، جس نے بدکاری کی اس کے لیے سزا ہے (بچہ اس کا نہیں کہلائے گا اور ان کا حساب کتاب اللہ کے ذمے ہے)۔ جس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی کی طرف نسبت کی یا کسی غلام نے اپنے کو کسی دوسرے مالک کی طرف منسوب کیا اس پر خدا کی لعنت ہے۔

قرض ادا کیا جائے گا، عاریت واپس کی جائے، ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے، خبردار! جرم کرنے والا خود اپنے جرم کا ذمہ دار ہے۔ باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں، اور بیٹے کے جرم کا ذمہ دار باپ نہیں۔

کسی شخص کے لیے بھائی کی کوئی چیز لینا جائز نہیں، البتہ اس صورت میں جائز ہے کہ وہ خوشدلی کے ساتھ دے، پس تم لوگ اپنے اوپر ظلم و زیادتی نہ کرو۔

لوگو! ہر مسلمان، دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان پس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔

تمہارے غلام، تمہارے غلام ہیں تم جو کچھ کھاتے ہو ان کو بھی کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہی انہیں پہناؤ۔

خبردار! میرے بعد گمراہ (یا کافر) نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ جس شخص کے پاس کسی کی امانت ہو اُس پر لازم ہے کہ وہ امانت والے کو ٹھیک ٹھاک طریقے سے لوٹا دے۔

اگر کوئی نکٹا اور سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ (قرآن مجید) کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو تم پر اس کی اطاعت لازم ہے۔

اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور تمہارے بعد کوئی نئی امت نہیں ہے۔

میں تم میں ایک نعمت چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم مضبوطی سے اسے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے اور وہ نعمت اللہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔

لوگو! مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو، کیونکہ تم سے پہلے بہت سی قومیں مذہب میں غلو کے سبب برباد ہوئیں۔

اے لوگو! اب شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ اس سرزمین پر اس کی پرستش ہو گی، لیکن عبادات کے سوا دوسرے معاملات میں اپنے پست افعال کے ذریعے اس کی فرمانبرداری کی گئی تو یہ اس پر بھی راضی رہے گا پس تم اپنے دین کو اس سے بچا کر رکھنا۔

خبردار! اپنے رب کی عبادت کرتے رہو، پنج وقتہ نمازوں کی پابندی کرو، ماہ رمضان کے روزے رکھو۔ اپنے اموال کی خوش دلی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اپنے رب کے گھر (بیت اللہ) کا طواف کرو، اپنے امراء کے حکم کی پیروی کرو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اے لوگو! نسئی کفر کی زیادتی کا سبب ہے، اس کے ذریعے کفار گمراہ ہوتے ہیں۔ وہ ایک سال حرام مہینوں کو حلال کر لیتے ہیں اور دوسرے سال انہی کو حرام قرار دے لیتے ہیں تاکہ اس حرام مہینوں کی گنتی پوری کریں لیکن اب زمانہ اپنی اس ابتدائی حالت پر لوٹ آیا ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا تھا۔ اللہ کے نزدیک سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں جن سے چار مہینے حرمت والے ہیں، تین مہینے مسلسل ہیں (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم) اور ایک ماہ رجب ہے جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان واقع ہے۔

خبردار! جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میری بات ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں کیونکہ بہت سے لوگ جن کو میرا پیغام پہنچے گا وہ ان لوگوں سے زیادہ اسے محفوظ رکھنے والے ہوں گے جو اس وقت سننے والے ہیں۔

تم لوگوں سے میرے متعلق بھی پوچھا جائے گا بتاؤ، تم میرے بارے میں کیا کہو گے؟ حاضرین نے (یک زبان ہو کر) عرض کیا! ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے امانت کو ادا کر دیا۔ اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور نصیحت کر دی پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلی آسمان کی جانب بلند فرما کر تین مرتبہ فرمایا۔ اے اللہ تو گواہ رہنا!

یہ اس سفر کے مختلف مراحل ہیں جن کو طے کر کے اسلامی انقلاب کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ان واقعات کو بیان کرنے سے اپنے اس دعوے کی تائید مقصود ہے کہ اسلامی معاشرتی اور سیاسی نظام عرب جاہلیہ کی روایت کا محض تسلسل ہی نہیں تھا بلکہ آنحضرت ﷺ نے ترمیم و تنسیخ کے ساتھ جہاں اچھی روایات کو اپنایا وہاں احکام الٰہیہ کی روشنی میں

سیاسی وسماجی نظام کو نئے اصول دیئے، نئی روایات قائم کیں اور یوں ایک منفرد نظام کو مستحکم بنیادوں پر استوار فرمایا۔

## عہد نبیؐ کا سیاسی نظام

کوئی بھی ریاست مضبوط و مستحکم نظام کے بغیر دیر تک اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ اس کے لیے ایک سیاسی تنظیم بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مدینہ طیبہ ہجرت کے بعد اسلامی ریاست کی جو داغ بیل ڈالی اس کو مستقل بنیادوں پر استوار کیا۔ عقائد اور فکر کے ساتھ سیاسی اداروں کو عملی شکل دی اور وہ جملہ امور جو کسی ریاست کے وجود اور بقاء کے لیے ناگزیر ہیں انہیں عملی شکل دے کر ریاستی ضرورتوں کو پورا کیا۔ ذیل میں ہم سب سے پہلے اسلامی ریاست کے تین بنیادی اصولوں یعنی اقتدارِ اعلیٰ کا تصور، رئیس مملکت اور شوریٰ کے خدوخال کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہاں ایک بنیادی اہمیت کی حامل بات کی جانب توجہ دلانا نہایت ضروری ہے۔ جس طرح یہ کہنا مبنی برحقیقت نہیں ہے کہ عہد نبویؐ کے تمام ادارات جاہلی ورثہ تھے اور ریاست مدینہ کا تمام نظم ونسق عرب جاہلیہ میں اس وقت رائج سیاسی نظاموں سے اخذ کرلیا گیا تھا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے رائج تمام نظاموں کو بالکلیہ مسترد فرمادیا۔ کیونکہ بعض سیاسی، سماجی اور مذہبی انتظامات ایسے ہیں جو عہد نبویؐ سے قبل بھی پائے جاتے تھے، مثلاً مشورہ کا اصول، صوبوں میں گورنروں کا تقرر، مذہبی رسوم بھی کسی قدر ملتی جلتی موجود تھیں۔ عہد نبویؐ کے مشہور سیاسی اداروں عرافہ اور نقابہ کا وجود بھی عہد جاہلیہ میں موجود ملتا ہے۔ علاوہ ازیں وصیت، میراث، ترکہ کے اسلامی اصولوں سے کس قدر مماثل معاشرتی نظام کے خدوخال بھی جاہلی دور میں نظر آتے ہیں۔ لیکن یہاں اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے کہ بعض آفاقی اصول ایسے ہوتے ہیں جنہیں کسی بھی نئی ریاست کا بانی نظر انداز نہیں کرسکتا اور اس مماثلت کے سبب انہیں ایک دوسرے کا چربہ قرار دینا قرین انصاف نہ ہوگا۔ یہاں ابن الطقطقی کا قول نقل کرنا زیادہ مناسب ہوگا، لکھتے ہیں:

> ''اسلامی حکومت، اپنی غایت اپنی سادگی اور اپنی عمومیت کے اعتبار سے ایک مستقل اور جداگانہ شئے ہیں، وہ ایک ایسی حکومت ہے جو عام دنیاوی حکومتوں سے بالکل الگ اور پیغمبرانہ اوصاف سے مستفید ہے''۔(۲۶)

ذیل میں اسلامی ریاست کے بنیادی عناصر کو ترتیب وار بیان کیا گیا ہے۔

### مقتدر اعلیٰ

اقتدار اعلیٰ (Soverignty) ایک جدید سیاسی اصطلاح ہے جو لاطینی لفظ (suparanus) سے نکلی ہے جس کے معنی برتر و اعلیٰ (Supereme) کے ہیں۔ مغربی سیاسی نظریہ کے مطابق ریاست کے عناصر اربعہ (آبادی، علاقہ، حکومت اور اقتدار اعلیٰ) میں سے اقتدار اعلیٰ کو اوّلین مقام حاصل ہے، اس کے بغیر کوئی ریاست، ریاست کہلانے کی مستحق نہیں۔ انگلستان میں سب سے پہلے اس نظریئے کو پیش کرنے والے تھامس ہابز (Thomas Hobbes) کے نزدیک اقتدارِ اعلیٰ بادشاہ کو حاصل ہے اور اس کا حکم قانون کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ معاہدہ عمرانی کے وقت عوام تو اپنے اختیارات بادشاہ کو سونپ دیتے ہیں لیکن بادشاہ ایسا نہیں کرتا۔ اس یکطرفہ معاہدہ کے بعد سے کامن ویلتھ وجود میں آجاتی ہے۔

انقلاب فرانس کے مفکرین میں سے روسو (Rousseau) نے اپنے نظریہ ارادہ عامہ (General Will) میں عوام کو طاقت کا سرچشمہ بتایا۔ اپنے اس نظریے کی مدد سے وہ ایک دوسرے نظریہ ریاست کی بنیاد افراد کی مرضی یا ارادہ پر ہے ''جبر یا طاقت پر نہیں'' کو ترقی دیتا ہے۔ اقتدار اعلیٰ کو عوام کے ہاتھوں میں دے کر وہ فرد کو دو مختلف کردار سونپتا ہے، ایک قانون سازی کا اور دوسرا قانون کی اطاعت کا، فرد مقتدر اعلیٰ ہونے کی وجہ سے قانون خود بناتا ہے لیکن رعایا ہونے کی وجہ سے اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت کرتا ہے۔

ریاست نبویؐ میں اقتدار اور حاکمیت اعلیٰ کا منصب اللہ رب العزت کے لیے مختص ہے، اسلامی نظریہ سیاست میں طاقت کا سرچشمہ ''اللہ رب العزت کی ذات وحدہ لاشریک ہے''۔ رسول اللہ ﷺ نے حاکمیت الٰہی کا نظریہ پیش بھی کیا اور اسے اپنی ریاست میں بہ تمام وکمال نافذ بھی فرمایا۔ اسلام کا موقف یہ ہے کہ ہر قسم کی حاکمیت کا مبدأ اور مرکز ذات واحد ہے۔ وہ کائناتی، سیاسی، قانونی، اخلاقی و اعتقادی، جملہ اقسام کی حاکمیت کا سرچشمہ اللہ کو ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ذَالِكُمَ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَفَاَنّٰى تُصْرِفُوْنَ﴾.(۲۷)

یہی اللہ تمہارا رب ہے، بادشاہت اسی کو ہے، کوئی الہ اس کے سوا نہیں، پھر تم کدھر پھرے جا رہے ہو۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾.(۲۸)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ محض خالق ہی نہیں آمر اور حاکم بھی ہے، علاوہ ازیں کائنات کو تخلیق کر کے وہ معطل نہیں ہو گیا، بلکہ اس پر حکمرانی کر رہا ہے۔

اسلامی اجتماعیات کے ماہرین نے اپنی تصریحات میں اسلام کے اقتدار اعلیٰ کے متعلق ایک قطعی راہ اختیار کی ہے کہ خدا کی حکومت کا اقتدار اعلیٰ بجائے خود خداوند برتر کا اقتدار اعلیٰ ہے۔امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

''دنیا کی ہر چیز اس کے تحت سلطنت کے ماتحت ہے اور تخت اس کے اقتدار اعلیٰ کے تابع ہے، اس کا اقتدار قدرت عامہ اور حکومت کمال کے ایسے منتہاء پر ہے کہ اس سے اوپر کوئی اقتدار نہیں۔ ہر کمی سے محفوظ اور ہر نقصان سے خالی اس کے غلبے اور تسخیر کی قوتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ حکومت اس کی چیز ہے اور سلطنت اس کی ملک''۔(۲۹)

ان تمام تصریحات سے جو بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام میں کسی کو بھی خواہ فرد ہو یا اجتماع یا پارلیمنٹ حتمی اتھارٹی حاصل نہیں۔ان میں سے کوئی بھی اس کا مجاز نہیں کہ وہ خداوند قدوس کے اٹل اصولوں میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی لا سکے۔اسلامی قوانین اور حاکمیت کا مرجع ومنبع صرف اللہ کی ذات ہے اور احکم الحاکمین کی تمام ہدایات آخری نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید میں محفوظ ہیں۔اسی اقتدار اعلیٰ میں ایک پہلو سنت کا بھی ہے۔اس کو ایک پہلو قرار دینے سے مقصد یہ ہے کہ ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ کے فرمان الٰہی کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی درحقیقت احکام الٰہیہ کا ہی حصہ ہے۔اور ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ کے حکم دے کر سنت رسول ﷺ کو قانون اسلامی کا بنیادی مآخذ قرار دے دیا ہے۔

''یہی محمدی تعلیم وہ بالاتر قانون ہے جو حاکم اعلیٰ (اللہ تعالیٰ) کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے، یہ قانون محمد ﷺ سے ہم کو دو شکلوں میں ملا ہے۔ایک قرآن جو لفظ بلفظ خداوند عالم کے احکامات وہدایات پر مشتمل ہے۔دوسرے محمد ﷺ کا اسوہ حسنہ یا آپؐ کی سنت جو قرآن کی منشا کی توضیح وتشریح کرتی ہے۔محمد رسول اللہ ﷺ خدا کے محض نامہ بر نہیں تھے کہ اس کی کتاب پہنچا دینے کے سوا ان کا کوئی کام نہ ہوتا وہ اس کے مقرر کیے ہوئے راہنما، حاکم اور معلم بھی تھے ان کا کام یہ تھا کہ اپنے قول اور عمل سے قانون الٰہی کی تشریح کریں، اس کا صحیح منشاء سمجھائیں اس کے منشاء کے مطابق افراد کی تربیت کریں پھر تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دے کر معاشرے کی اصلاح کے لیے جدوجہد کریں،

پھر اس اصلاح شدہ معاشرے کو ایک صالح و مصلح ریاست کی صورت دے کر یہ دکھا دیں کہ اسلام کے اصولوں پر ایک مکمل تہذیب کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا یہ پورا کام جو ۲۲ سال کی پیغمبرانہ زندگی میں آپ نے انجام دیا، وہ سنت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے اور اسی قانون برتر کا نام اسلامی اصطلاح میں شریعت ہے''۔(۳۰)

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اقتدار اعلیٰ اللہ کی ذات کو حاصل ہے لیکن اس کی عملی شکل کی صورت کیا ہوگی، یعنی نیابت الٰہی کا فریضہ کون سرانجام دے گا۔ شیعہ کے نزدیک ''خلافت بھی دین کا ایک رکن ہے اور اس کے لیے امت کا مشورہ ضروری نہیں۔(۳۱) ان کے نزدیک خلافت کا منصب آنحضرت ﷺ کے خاندان کے ساتھ خاص ہے۔ یہ اہل بیت کے حامی تھے اور ان کا خیال تھا کہ خلافت کا حق اہل بیت تک اور وہ بھی صرف حضرت علیؓ کی اولاد میں محدود رہنا چاہیے۔

خوارج کا ابتداء میں نظریہ یہ تھا کہ خلافت پر عربی النسل متنفس کا حق ہے، خوارج کے زاویہ نگاہ سے خلیفہ کا معزول کرنا حتی الامکان جائز نہ تھا لیکن اگر خلیفہ جبر و استبداد کا مرتکب ہو تو نہ صرف معزول کرنا جائز تھا بلکہ مصلحت وقت کے لحاظ سے اس کا قتل کر دینا بھی ان کے اعتقاد میں معیوب نہ تھا۔(۳۲)

معتزلہ یا قدریہ کے نزدیک امامت امت مسلمہ کا حق ہے، دلیل یہ تھی کہ خدا نے اس منصب کے لیے کسی خاندان یا فرد کی تعیین نہیں کی، امت کو اختیار ہے کہ تنفیذ احکام کے لیے وہ اپنا فرمانروا یا خلیفہ جس کو چاہے منتخب کر لے۔(۳۳)

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں: ''قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اللہ کی نیابت کا یہ مقام کسی فرد واحد، یا کسی خاندان یا کسی خاص مخصوص طبقے کا حق نہیں ہے بلکہ تمام ان لوگوں کا حق ہے جو اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کریں اور رسولؐ کے ذریعے سے پہنچے ہوئے قانون کو بالاتر قانون مان لیں.....اہل مغرب جس چیز کو لفظ جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں اس میں جمہور کو حاکمیت قرار دیا جاتا ہے اور ہم مسلمان جسے جمہوریت کہتے ہیں اس میں جمہور صرف خلافت کے حامل ٹھہرائے جاتے ہیں، ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے ان کی جمہوریت میں بھی عام رائے دہندوں کی رائے سے حکومت بنتی اور بدلتی ہے اور ہماری جمہوریت بھی اس کی متقاضی ہے مگر فرق یہ ہے کہ اس کے تصور کے

مطابق جمہوری ریاست مطلق العنان اور مختار مطلق ہے اور ہمارے تصور کے مطابق جمہوری خلافت اللہ کے قانون کی پابند۔(۳۴)

## امیر کی حیثیت

گزشتہ صفحات میں ''شہری مملکت مکہ'' کے ضمن میں یہ بات بالصراحت بیان کی گئی تھی کہ عرب جاہلیہ میں سیاسی انارکی کے باوجود جب حضور اکرم ﷺ کے جدامجد قصی بن کلاب نے مکہ پر قبضہ کر کے یہاں حکومت قائم کر لی تو اہل مکہ نے ان کے حکم کو بلا چون و چرا تسلیم کیا۔ روایت کیا گیا کہ:

> ''جس طرح مذہب کی پیروی کی جاتی تھی، اہل مکہ اسی طرح قصی کے حکم کی پیروی کرتے تھے، زندگی تو زندگی مر جانے کے بعد بھی انہی کے حکم پر عمل ہوتا تھا''۔

اس تحریر کے تکرار سے مقصود یہ ہے کہ اہل مکہ کے ہاں ایام جاہلیت میں اطاعت امیر کا اصول تو تمام جزئیات کے ساتھ عملی صورت میں موجود تھا۔ اسلام نے اطاعت امیر کو اصول وضوابط کا پابند بنا کر ان کے ہاں پائے جانے والے اس جذبے کو ایک نئی شکل دی۔

قرآن مجید میں جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری کا حکم دیا گیا وہاں اس سے متصل ''اولی الامر'' کی اطاعت کا حکم بھی دے دیا گیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ أَطِيْعُواْ اللّهَ وَأَطِيْعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيْلاً﴾(۳۵)

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں، پھر اگر نزاع ہو جائے تمہارے درمیان کسی چیز میں تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر مانتے ہو اللہ کو اور قیامت کے دن کو یہی روش اچھی ہے اور بہت بہتر ہوگا اس کا انجام۔

امام ابن جریر نے صحابہ وتابعین سے اولی الامر کی تفسیر میں دو قول نقل کیے ہیں: ایک یہ کہ ''ہم الامراء'' یعنی مسلمانوں کے حکمرانوں اور امراء مراد ہیں جن کی اطاعت کا حکم ہے اور دوسرا یہ کہ ''الافقہ والدین'' یعنی یہ فقہاء اور

دینی سربراہ ہیں۔ یہ دونوں آراء نقل کرنے کے بعد ابن جریر اپنی رائے یہ بیان کرتے ہیں:

**و أولی الأقوال فی ذالک قول من قال هم الأمراء والولاه.** (۳۶)

یعنی بہترین قول ان حضرات کا ہے جو کہتے ہیں کہ ان سے مراد امراء اور حکام ہیں۔

امام فخر الدین رازی نے اولی الامر کی تفسیر اہل الحل والعقد سے کی ہے یعنی ''وہ لوگ جو مسلمانوں کے معاملات کے ذمہ دار اور مستند نمائندے ہوں اور فیصلے کرنا ان کے ہاتھ میں ہو۔ (۳۷)

آنحضرت ﷺ اطاعت امیر سے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

**من اطاعنی فقد اطاع الله ومن عصانی فقد عصی الله ومن اطاع امیری وفی روایة من اطاع الامیر فقد اطاعنی ومن عصی امیری و فی روایة من عصی الامیر فقد عصانی.** (۳۸)

جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے امیر یا مسلمانوں کے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر یا مسلمانوں کے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا:

''اگر تم پر ناک کٹا ہوا سیاہ فام غلام بھی امیر مقرر کیا گیا ہو جو تمہاری قیات کتاب اللہ کے مطابق کر رہا ہو تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (۳۹)

اس حدیث طیبہ میں ''جو تمہاری قیادت کتاب اللہ کے مطابق کر رہا ہو'' ارشاد فرما کر اطاعت امیر کو محدود کر دیا گیا۔ یعنی اگر وہ حدود اللہ سے تجاوز کر رہا ہو تو ان حالات میں اطاعت امیر جائز نہیں۔ خلیفہ اوّل سیّدنا صدیق اکبرؓ نے بار خلافت سنبھالنے کے بعد اپنے اوّلین خطبہ میں اسی نکتہ کا برملا اظہار فرمایا تھا:

**فاذا رأیتمونی قد استقمت فاتبعونی ان زغت فقد قومونی.** (۴۰)

جب تم مجھے دیکھو کہ میں سیدھے راستے پر چل رہا ہوں تو میری اتباع کرو اور میں راہِ راست سے ہٹ جاؤں تو مجھے ٹھیک کر دو۔

## شوریٰ

ایام جاہلیہ میں عربوں کے ہاں بالخصوص اہل مکہ کے ہاں شوریٰ کا نظام عملاً موجود تھا۔ اس ضمن میں ''دارالندوہ'' کو بہت شہرت حاصل ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے موقع پر اسی دارالندوہ میں آپ کے قتل کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا (نعوذ باللہ من ذالک) ابن ہشام لکھتے ہیں:

**معذور خروج رسول الله و عرفوا انه قد اجمع لحربهم فاجتمعوا له فی دارالندوة وهی دار قصی بن کلاب التی کانت قریش لا تقضی امرا الا فیها یتشاورون فیها.** (۴۱)

آنحضرت ﷺ کے ہجرت کر جانے سے قریش خوف زدہ ہو گئے اور انہوں نے خیال کیا کہ آپ ان سے جنگ کی تیار کر رہے ہیں پس وہ دارالندوہ یعنی قصی بن کلاب کے گھر پر مشورہ کے لیے جمع ہوئے اور قریش کسی اہم معاملے کا فیصلہ اس مقام پر جمع ہو کر مشورہ کیے بغیر نہیں کرتے تھے۔

ابن ہشام قصی کے متعلق جن کا ذکر سابقہ روایت میں مذکور ہے، لکھتے ہیں:

> ''کعب بن لوی کی اولاد میں قصی پہلا شخص تھا جسے مکہ میں سلطنت حاصل ہوئی اور جس کی قریش اطاعت کرنے لگے، اس کے ہاتھ میں بیت اللہ کی نگرانی حاجیوں کو پانی پلانا، حج کے زمانے میں باہر سے آنے والوں کی مہمان نوازی، اکابر قریش کی مجلس کی صدارت جنگی قیادت جیسے پانچ کلیدی منصب تھے۔ اس طرح اس نے اپنے دامن میں مکہ کے سارے شرف و مجد کو سمیٹ لیا تھا۔ قریش کے کسی مرد یا عورت کا نکاح، پیش آمدہ کسی اہم معاملے میں مشورہ اور کسی اجنبی قبیلہ سے جنگ کا فیصلہ اسی کے گھر پر ہوتا تھا جس کا صدر اس کی اولاد میں سے کوئی ہوتا تھا۔ جب کوئی لڑکی بالغ ہوتی تو اس کے گھر میں اسے اوڑھنی اڑھائی جاتی اور اسے اس کے گھر پہنچایا جاتا''۔ (۴۲) (گویا یہ اس کے قابل نکاح ہونے کا اعلان تھا)۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قریش ایک شورائی نظام حکومت سے واقف تھے، مکہ کی حکومت میں شورائیت کا عنصر موجود تھا۔ چنانچہ اسلام نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے اس ادارہ کو قائم ہی

نہیں رکھا بلکہ اس کی اصلاح وتہذیب کر کے دینی سیاست میں اس کو غیر معمولی اہمیت دی۔

اسلام میں امیر جہاں قرآن وسنت کا پابند ہوتا ہے، وہاں اسے ایمان والوں سے مشورہ کا بھی حکم دیا گیا ہے۔اجتماعی امور کو حل کرنے اور بنیادی معاملات کے فیصلے کا حق کسی خاص فرد کے حوالے کرنے کے بجائے ساری امت کے حوالے کیا گیا ہے۔سورۃ شوریٰ جو ایک مکی سورۃ ہے اور جس میں خالص اصولی ہدایات کی تفصیل دی گئی ہے، میں ایک مقام پر ان مومنین صادقین کی مدح وتوصیف کی گئی ہے جن کے لیے آخرت کی کامیابی مقدر ہو چکی ہے۔انہی کے سلسلے میں فرمایا جارہا ہے کہ یہ صادق الایمان اور اعلیٰ کردار سے آراستہ افراد ہیں جو خدا کے رسول کی دعوت کو دل وجان سے قبول کرتے اور اپنی ساری عملی توانائیوں کو اس کی اتباع میں لگا دیتے ہیں۔اس وصف کلی کے بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا کہ یہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں یعنی ان کا تعلق اپنے مولیٰ وآقا کے ساتھ حد درجہ پائیدار اور عملی ہوتا ہے،ان کی دوسری نمایاں ترین صفت یہ ہے کہ:

﴿وَ أَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾(۴۳)

(ترجمہ):ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔

علامہ ابوبکر جصاص حنفی اس آیۃ کریمہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''ایمان واقامت صلوٰۃ کے ساتھ شوریٰ کا تذکرہ اس کی جلالت شان پر دلالت کرتا ہے اور ساتھ ہی اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ امت مسلمہ مشورہ کرنے پر مامور اور اس کی پابندی ہے''۔(۴۴)

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''صحابہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے روبرو کوئی معاملہ پیش ہوتا تو وہ جمع ہوتے اور مشورہ کے ذریعے اسے طے کرتے۔اللہ نے ان کی اس صفت کی تعریف کی کہ وہ کسی معاملہ میں انفرادیت نہیں برتتے، بلکہ اس کے برعکس جب تک کسی معاملہ پر متفق نہیں ہوجاتے اقدام نہیں کرتے''۔(۴۵)

ہجرت کے دو ہی سال بعد معرکہ بدر وقوع پذیر ہوا جو اسلامی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔اس اہم اور فیصلہ کن معاملہ کا فیصلہ بھی باہم مشورہ سے کیا گیا۔نبی کریم ﷺ نے معاملہ کے تمام نشیب وفراز کو قوم کے سامنے واضح الفاظ میں بیان کیا اور قوم کے اجتماعی فیصلے سے معرکہ بدر قائم ہوا۔میدانِ بدر میں پڑاؤ کی جگہ کو بھی

حباب بن منذر کے مشورہ سے تبدیل کر دیا گیا۔اسی جنگ میں قید ہونے والے ابوالعاص کا فدیہ بھی باہم مشورہ سے معاف کیا گیا۔

غزوہ احد میں آنحضرت ﷺ کی ذاتی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے جبکہ صحابہ کی اکثریت کی خواہش یہ تھی کہ وہ مدینہ سے باہر نکل کر شوق جہاد پورا کریں۔حافظ ابن کثیر اس صورت حال کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"و ابی کثیر من الناس الا الخروج الی العدو ولم یتناهوا الی قول رسول اللّٰه و رأیه". (۴۶)

(ترجمہ) اکثریت مدینہ سے باہر نکلنے پر مصر تھی اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

آنحضرت ﷺ ملکی مسائل بھی تمام اہل مدینہ کے براہِ راست مشورے سے طے کرتے تھے اور کبھی گفتگو مہاجرین وانصار تک محدود رہتی تھی۔بنیادی اور اہم معاملات میں بالعموم پہلی صورت اختیار کی جاتی۔

دورِ جاہلیت کے قبائلی نظام میں ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا۔اسلام نے اسی نظام کو باقی رکھا اور مناسب اصلاح کے بعد اپنے اعلیٰ مقاصد کے لیے استعمال کیا، جس وقت انصار نے بیعت عقبہ میں آنحضرت ﷺ کی حمایت کا حلف اٹھایا تھا، اس وقت آپ نے انصار سے فرمایا تھا کہ تم اپنے نمائندوں کو پیش کرو جو اپنی قوم کی تائید و حمایت کے ذمہ دار بنیں، چنانچہ اسی وقت مدینہ نے قبیلہ خزرج کی مختلف شاخوں کے نو اور قبیلہ اوس کے تین نمائندے پیش کیے جنہوں نے وفاداری ونصرت کا عہد کیا۔(۴۷) عہد جاہلیہ کے دو مشہور اداروں عریف اور نقیب کو بھی زندہ رکھا گیا۔ذیل میں چند واقعات کی جانب توجہ مبذول کرائی جاتی ہے جس سے عہد نبویؐ میں شوریٰ کی عملی شکل پر روشنی پڑتی ہے۔

جنگ بدر کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے اپنی رائے کو تبدیل فرما کر مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کا فیصلہ فرما لیا۔اس کے علاوہ عہد نبویؐ میں ۱ ہجری میں اذان سے متعلق مشورہ لیا گیا۔۲ ہجری میں اسیرانِ بدر کے سلسلے میں، ۶ھ میں واقعہ افک سے متعلق اور ۶ھ ہی میں حدیبیہ کے مقام پر استصوابِ رائے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ ۸ھ میں اسیران ہوازن سے متعلق شوریٰ طلب کی گئی اور ۱۰ھ میں معاذؓ بن جبل کو یمن کا گورنر مقرر کرتے وقت طلب کیا گیا۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ استصوابِ رائے کی صورت میں حق رائے دہی کے لیے صرف دو شرطیں ہیں۔اسلام اور اسلامی شعور، اس کے علاوہ نہ کسی علمی ڈگری کی ضرورت ہے نہ ثروت مندی کی۔نہ کسی خاص قیمت کی

جائیداد کے مالک ہونے کی، نہ رنگ ونسل کی نہ قوم ووطن کی۔ اس صورت میں مرد عورتیں، بوڑھے، بچے، شہری اور دیہاتی مقام اور مسافر سب حق رائے دہی رکھتے ہیں۔

بات کو مختصر کرتے ہوئے ذیل میں ان اہم واقعات کی نشاندہی کر دی جاتی ہے، جن کے فیصلے کے لیے شوریٰ کے اجلاس منعقد ہوئے۔

۱۔ شوریٰ، اذان ۱ھ

۲۔ شورائے بدر ۲ھ

۳۔ شورائے اسیران بدر ۲ھ

۴۔ شورائے احد ۳ھ

۵۔ شورائے خندق ۵ھ

۶۔ شورائے خندق دوبارہ مصالحت ۵ھ

۷۔ شوریٰ متعلق افک بر عائشہ ۶ھ

۸۔ شورائے حدیبیہ ۶ھ

۹۔ شورائے اسیران ہوازن ۸ھ

۱۰۔ شوریٰ متعلق معاذ بن جبل ۱۰ھ۔ (۴۸)

## ریاستی نظم ونسق

عہد نبوی میں اگرچہ تمام اختیارات آنحضرت ﷺ کی ذات میں مرکوز تھے، تاہم آپ نے اپنی مدد اور نظم و نسق کو چلانے کے لیے مختلف لوگوں کو مختلف ذمہ داریاں سونپیں۔

## نائبین رسولؐ

آنحضرت ﷺ جب مدینہ طیبہ سے باہر کہیں تشریف لے جاتے تو کسی کو اپنا جانشین مقرر فرماتے تھے۔ یہ جانشین رسول محض نماز کے لیے آپ کا نائب نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ آپ کا بحیثیت سربراہِ مملکت کے جانشین وخلیفہ ہوتا تھا اور وہ آپ کی غیر موجودگی میں مدینہ میں موجود و مقیم امت مسلمہ کی فلاح و بہبود اور اسلامی ریاست کے امور کی نگرانی کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ شروع کے دو غزوات ودان اور بواط میں رسول اکرم ﷺ نے بالترتیب خزرج اور اوس کے

قبائلی سرداروں حضرت سعدؓ بن عبادہ اور سعدؓ بن معاذ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ جنگ بدر کے موقع پر نائبین کی تقرری کے مسئلہ پر مورخین میں کچھ اختلافات پایا جاتا ہے۔ ابن اسحاق اور ابن ہشام کا خیال یہ ہے کہ پہلے آنحضرت ﷺ نے حضرت ام مکتوم کو اس عہدہ پر سرفراز فرمایا تھا لیکن بعد میں کچھ مصالح کے پیش نظر آپ نے ان کی جگہ حضرت ابو لبابہ بشیر بن عبدالمنذ رخزرجی کی تقرری فرمائی اور ان کو آپ نے بدر کی طرف اپنے کوچ کے دوران روحاء نامی مقام سے واپس بھیجا تھا کہ وہ حضرت ابن ام مکتوم کی جگہ لے لیں۔ جبکہ بعض دوسرے مورخین کا خیال ہے کہ حضرت ابو لبابہ نے جس نائب رسول ﷺ کی جگہ سنبھالی تھی وہ حضرت ابن ام مکتوم نہیں تھے بلکہ حضرت عاصم بن عدی اوسی تھے لیکن ان تمام ماخذ کا اتفاق ہے کہ غزوہ بدر کے دوران دوسرے نائب رسول حضرت حارث بن حاطب تھے، جن کو شہر کے بالائی حصہ کے لوگوں کی دیکھ بھال کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ ۳ھ میں ایک غزوہ کے موقع پر حضرت عثمان بن عفانؓ اموی کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔ اسی طرح حضرت سباع بن عرفطہ غفاری کو تین مرتبہ خلیفہ رسول ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، غزوہ تبوک کے دوران حضرت علیؓ بن ابی طالب کو صرف خاندانِ رسالت میں جانشینی کی یہ سعادت حاصل ہوئی۔

## مشیرانِ نبوی ﷺ

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ کے حکم الٰہی کے مطابق آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ مشورہ کو بہت اہمیت دی اور اہم سیاسی معاملات کا فیصلہ صحابہ کرامؓ کے مشورہ کی روشنی میں ہی کیا۔ شوریٰ کی بحث میں اس کا تفصیلی ذکر گزر چکا ہے اور بعثت سے پہلے مکہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس بات کو بھی بالصراحت بیان کیا گیا ہے کہ مکہ میں ایک ایسا نظام قائم تھا جس میں مشیروں اور وزیروں کو مختلف ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں اور دس ارکان پر مشتمل کابینہ کا تفصیلی ذکر بھی موجود ہے جو دس بڑے خانوادوں کے سرداروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ آنحضرت ﷺ مشاورت کے اصول پر ہمیشہ کاربند رہے اور مشیرانِ نبوی کا تقرر بھی عمل میں لایا گیا۔ ان مشیرانِ نبوی کو وزراء کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ وزیر کا لفظ قرآن وسنت میں مذکور ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں ہے:

﴿وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِنْ أَهْلِي هَارُونَ اَخِي اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي وَ أَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي﴾ (۴۹)

موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے رب دیجئے مجھ کو ایک وزیر میرے گھر کا، ہارون میرا بھائی، اس سے مضبوط کر میری کمر اور شریک کر اس کو میرے کام میں۔

حدیث طیبہ میں عبداللہ ابن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

**ثم نظر فی قلوب العباد بعد فاختار له اصحابا فجعلهم انصار دینه و وزراء نبیه.(۵۰)**

(ترجمہ) پھر اللہ نے محمد کے بعد اپنے بندوں کے دلوں کو دیکھا تو اس کے لیے ایسے ساتھی پسند کر لیے جو اس کے دین کے مددگار تھے اور اس کے نبی کے وزیر تھے۔

ایک حدیث میں مذکور ہے:

''ہر نبی کے دو وزیر آسمان میں اور دو زمین پر ہوتے ہیں۔ میرے آسمان کے وزیر تو جبریل اور میکائیل ہیں جبکہ زمین پر میرے دونوں وزراء ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں۔(۵۱)

مشیرانِ نبوی یا وزراء رسالتمآب ﷺ میں جن حضرات کے اسماء گرامی نمایاں نظر آتے ہیں، ان میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت حمزہ، حضرت حباب بن منذر، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت سعد بن معاذ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے متعدد بڑے صحابہ کرامؓ شامل تھے۔ شوریٰ کا رکن بننے کے لیے کسی رسمی طریقہ کار کی ضرورت نہ تھی البتہ صلاحیت و لیاقت ناگزیر تھی۔ دارالندوہ کے ضمن میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ بعثت اسلام سے قبل اہل مکہ کے ہاں جو شورائی نظام تھا اس میں بھی شمولیت کے لیے کوئی رسمی کارروائی تو نہ کی جاتی تھی البتہ عمر رسیدہ ہونا، بالغ نظر ہونا، قبیلہ میں ممتاز مقام کا حامل ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ البتہ بعض لوگوں کو اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے سبب صغرسنی میں ہی شوریٰ کا رکن بنا لیا گیا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے اس ادارہ کو قائم رکھا اور ان مذکورہ صفات کے ساتھ دینی وابستگی کو بھی ملحوظ رکھا۔

## کاتبین

کاتب کے لغوی معنی لکھنے کے ہیں اور اس کا کام وہی ہوتا ہے جو آج کے تنظیمی ڈھانچہ میں سیکرٹری سرانجام دیتا ہے۔

مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد کاتبوں کے قیام کی نوعیت مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی رنگ بھی اختیار کر گئی تھی۔ چودھویں صدی کا ایک متأخر مصنف القلقشندی اپنے زمانے کے ریاستی شعبہ دیوان الانشاء (شعبہ مراسلات و رسل و رسائل) کے نقطہ آغاز سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ پہلا دیوان تھا جو اسلام میں پہلی بار اس وقت متعارف ہوا تھا جب رسول اکرم ﷺ نے اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ کاتبین جنہیں عہد نبویؐ میں

اس کام کے کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، مورخین نے ان کی تعداد مختلف بتائی ہے۔ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں محض چند کے نام گنوائے ہیں جبکہ واقدی نے متعدد کاتبوں کا ذکر کیا ہے۔ ابن سعد نے سولہ کاتبوں کا ذکر کیا ہے۔(۵۲)

بلاذری اور طبری نے صرف دس نام گنوائے ہیں۔ سب سے زیادہ نام گنانے کا شرف برہان الدین صاحبِ حلبی کتاب سیرۃ حلبیہ کو حاصل ہے جس کے مطابق ان کی کل تعداد ۴۳ تھی۔ مشہور کاتبین وحی کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب
۲۔ حضرت ابی بن کعب خزرجیؓ
۳۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ
۴۔ حضرت خالدؓ بن سعید اموی
۵۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ ثقفی
۶۔ حضرت علاءؓ بن عقبہ
۷۔ حضرت ارقمؓ بن ارقم مخزومی
۸۔ حضرت ثابتؓ بن قیس
۹۔ حضرت عثمانؓ بن عفان اموی
۱۰۔ حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی
۱۱۔ حضرت جہیمؓ بن صلت
۱۲۔ حضرت علاءؓ بن حضرمی
۱۳۔ حضرت عبداللہؓ بن زید
۱۴۔ حضرت عبداللہؓ بن بکر تیمی
۱۵۔ حضرت محمدؓ بن مسلمہ اوسی
۱۶۔ حضرت زبیرؓ بن عوام اسدی

یہ بحث حضرت بلالؓ حبشی کے ذکر کیے بغیر نامکمل ہوگی۔ ہر چند کہ بلال حبشی کا اسم گرامی کاتبین کی فہرست

میں شامل نہیں، لیکن حقیقتاً انہیں حضورﷺ کے سیکرٹری کا درجہ حاصل تھا۔ حضرت بلالؓ آپ کے تمام گھریلو امور، قرضوں کی فراہمی اور ادائیگی کے انتظامات، مہمانوں کی آسائش اور دیگر متعدد کاموں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ وہ رسول کریمﷺ کو نمازوں کے اوقات اور جماعت کی تیاری کی اطلاع بھی کرتے تھے۔ صاحب اسد الغابہ کا بیان کہ حضرت بلالؓ آنحضرتؐ کے خازن بھی تھے۔ الغرض اس ضمن میں حضرت بلالؓ کو نہایت اہمیت حاصل تھی۔

## دورِ نبویؐ کے امراء الجیش (فوجی کمانڈر)

آنحضرتﷺ نے اسلامی ریاست کے دفاع اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے فوج کے قیام، اس کی تنظیم اور اس کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ باقاعدہ فوجی افسران کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ ان فوجی قائدین کی ایک فہرست ''الطبقاتِ الکبریٰ'' میں مذکور ہے۔ (۵۳) ان فوجی قائدین کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی۔ طبقات میں مذکور فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی
۲۔ عبیدہ بن حارث
۳۔ سعد بن ابی وقاص
۴۔ عبداللہ بن جحش اسدی
۵۔ عمیر بن عدی بن خرشہ خطمی
۶۔ سالم بن عمیر العمری
۷۔ محمد بن مسلمہ
۸۔ زید بن حارثہ
۹۔ ابومسلمہ بن عبدالاسد مخزومی
۱۰۔ عبداللہ بن انیس
۱۱۔ منذر بن عمرو الساعدی
۱۲۔ عاصم بن ثابت الانصاری
۱۳۔ مرثد بن ابی مرثد غنوی
۱۴۔ عکاشہ بن محص اسدی

۱۵۔ ابوعبیدہ بن جراح

۱۶۔ عبدالرحمٰن بن عوف

۱۷۔ علی بن ابی طالب ہاشمی

۱۸۔ عبداللہ بن عتیک

۱۹۔ عبداللہ بن رواحہ

۲۰۔ کرز بن جابرالفہری

۲۱۔ عمر بن امیہ

۲۲۔ عمر بن خطاب

۲۳۔ صدیق اکبر

۲۴۔ بشیر بن سعد انصاری

۲۵۔ غالب عبداللہ

۲۶۔ ابن ابی العوجاء سلمی

۲۷۔ شجاع بن وہب اسدی

۲۸۔ کعب بن عمیر غفاری

۲۹۔ جعفر بن ابی طالب ہاشمی

۳۰۔ خالد بن ولید

۳۱۔ عمرو بن العاص

۳۲۔ ابوقتادہ

۳۳۔ سعد بن زید اشہلی

۳۴۔ طفیل بن عمر والدوسی

۳۵۔ عیینہ بن حصن فزاری

۳۶۔ قطبہ بن عامر بن حدیدہ

۳۷۔ ضحاک بن سفیان کلابی

۳۸۔ علقمہ بن مجرز مدلجی

۳۹۔ عبداللہ بن حذافہ سہمی

۴۰۔ اسامہ بن زید

۴۱۔ ابو عامر اشعری

۴۲۔ جریر بن عبداللہ البجلی

آخری دو حضرات کا ذکر ابن سعد نے نہیں کیا لیکن بخاری شریف میں آیا ہے کہ ابو عامر اشعری کو جنگ امطاس کا امیر بنایا گیا تھا اور حضرت جریر کو اس فوجی دستے کا امیر مقرر کیا گیا تھ جو یمن میں ذوالخلصہ نامی بت خانہ کو مسمار کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

## عہد نبوی کے امراء البلاد (علاقائی حکام)

آنحضرت ﷺ ریاست مدینہ کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس میں شامل ہونے والے علاقوں کے انتظام، دیکھ بھال اور لوگوں کے امور کے فیصلوں کے لیے مختلف امراء کا تقرر عمل میں لائے۔ بخاری شریف کی روایت میں ے اس کی وضاحت موجود ہے۔

**کان النبی ﷺ یبعث من الامراء والرسل واحد بعد و بعد.** (۵۴)

نبی کریم ﷺ مقرر فرماتے تھے اور امراء کو بھیجا کرتے تھے۔ سفیروں کو ایک کے بعد دوسرے کو۔

امراء کو روانہ کرتے وقت آپ ﷺ خصوصی ہدایات بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ (مثلاً دس ہجری میں معاذ بن جبل کو بالائی یمن اور ابوموسیٰ اشعری کو زبریں یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو جاتے وقت ان دونوں کو درج ذیل ہدایت فرمائی:

> ''لوگوں پر آسانی کروگے، نرمی کا رویہ اختیار کروگے اور سختی نہیں کروگے، اسلام پر عمل کرنے والوں کو بشارت دیتے رہو اور ایسا طرز عمل اختیار نہ کرو جس سے لوگ اسلام سے متنفر ہو جائیں''۔ (۵۵)

بلاذری نے فتوح البلدان میں مختلف مقامات پر امراء کا تذکرہ کیا ہے، آنحضرت ﷺ نے مختلف اوقات میں جن امراء کا تقرر فرمایا وہ حسب ذیل ہیں:

| نام امیر | علاقہ |
|---|---|

| | |
|---|---|
| عتاب بن اسید | مکہ مکرمہ |
| عثمان بن ابوالعاص ثقفی | طائف |
| علاء بن الحضرمی | بحرین |
| عمرو بن عاص | عمان |
| ابوسفیان بن حرب اموی | نجران |
| باذان بن ساسان | یمن |
| شہر بن باذان | یمن |
| مہاجر بن امیہ | یمن |
| ابان بن سعید بن عاص | یمن |
| ابوموسیٰ اشعری | یمن سواحل |
| معاذ بن جبل | یمن جند |
| یزید بن ابی سفیان | تیماء |
| ثمامہ بن اثال | الیمامہ |
| عمرو بن سعید بن عاص | وادی قری (خیبر) (۵۶) |

علامہ بلاذری نے تین دوسرے درج ذیل ناموں کا بھی ذکر کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| خالد بن سعید بن عاص | یمن |
| زیاد بن بسید انصاری | حضرموت |
| عمرو بن حزم | نجران (۵۸) |

## عہد نبویؐ کے امراء صدقات

ابن ہشام، ابن حزم، ابن جریر، ابن کثیر اور ابن اثیر سب نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ریاست مدینہ میں شامل تمام علاقوں میں صدقات وصول کرنے کے لیے امراء کو مقرر فرمایا تھا۔

چند مشہور امراء صدقات درج ذیل ہیں۔

| نام امیر | نام علاقہ |
|---|---|

| | |
|---|---|
| مہاجر بن امیہ | صنعاء یمن |
| زیاد بن لبید انصاری | حضرموت |
| عدی بن حاتم طائی | بنوطی و بنواسد |
| زبرقان بن بدر | بنوسعد بن زید کا ایک علاقہ |
| قیس بن عاصم | بوسعد بن زید کا دوسرا علاقہ |
| مالک بن نویرہ | بنوحنظلہ |
| علاء بن الحضرمی | بحرین |
| علی بن ابی طالب ہاشمی | نجران |
| عمر بن خطاب | نجران (۵۷) |

## مہر (الخاتم)

ریاست کے لیے سرکاری مہر کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں بھی ''الخاتم'' (مہر) کو قانونی اہمیت حاصل تھی۔ امام ابوداؤد نے اپنی کتاب سنن ابی داؤد میں ''کتاب الخاتم'' کے نام سے مستقل عنوان قائم کیا ہے جس میں آٹھ ابواب ہیں اور ۲۶ حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ ایک دو روایت درج کی جا رہی ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے جب عجم کے لوگوں کو خطوط بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو بعض صحابہ نے کہا کہ یہ لوگ ایسا خط وصول ہی نہیں کرتے جس پر مہر نہ لگی ہو، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے چاندی کی ایسی مہر (انگوٹھی) بنوائی جس پر ''محمد رسول اللہ'' لکھا ہوا تھا۔ (۵۹)

> ''ابن عمر رضی اللہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ کے بعد یہ مہر ابوبکرؓ کے پاس تھی لیکن بعد میں حضرت عثمانؓ سے اریس نامی ایک کنویں میں گر گئی تھی''۔ (۶۰)

## عہد نبوی میں سزائیں نافذ کرنے والا عملہ

مجرموں کو سزائیں دینے کے لیے کسی وقت کسی کو بھی طلب کیا جا سکتا تھا۔ لیکن کچھ افراد اس کام کے لیے مخصوص بھی تھے۔ گویا یہ عہد نبوی کی پولیس تھی۔

اس ضمن میں مشہور حضرات کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت علی بن ابی طالب

۲۔ حضرت زبیر بن عوام

۳۔ حضرت مقداد بن عمرو

۴۔ حضرت عاصم بن ثابت

۵۔ حضرت محمد بن مسلمہ

۶۔ حضرت ضحاک بن سفیان کلابی

۷۔ حضرت قیس بن سعد بن عبادہ

زادالمعاد میں حضرت قیس بن سعد بن عبادہ سے متعلق ایک روایت نقل کی گئی ہے۔

**و کان قیس بن سعد الانصاری منه بمنزلة صاحب الشرطة من الامیر.** (۶۱)

اور قیس بن سعد رسول اللہ ﷺ کے دربار میں پولیس افسر یا کوتوال کی حیثیت رکھتے تھے۔

## عہد نبوی میں بازاروں کی نگرانی کرنے والا عملہ

بازاروں اور مارکیٹ کی قیمتوں کے توازن اور استحکام کی ذمہ داری بھی ریاست پر عائد ہوتی ہے سو اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آنحضرت ﷺ نے سعید بن عاص کو مکہ کے بازار کی نگرانی کے لیے مامور فرمایا تھا، اسلامی اصطلاح میں اس نظام کو حسبہ کا نام دیا گیا اور اس ذمہ داری کو ادا کرنے والے کو ''المحتسب'' کہا جاتا ہے۔(۶۲)

ایک وقت مدینہ کے بازار کی نگرانی کے لیے حضرت عمرؓ کو مامور کیا گیا۔(۶۳)

## عہد نبویؐ کے سفراء مملکت

آنحضرت ﷺ نے اپنے مشن، مقاصد اور دعوت الی اللہ کے لیے مختلف ممالک میں سفراء کو بھیجا، قیصر و کسریٰ کو بھیجی جانے والی سفارتیں روانہ کی گئیں۔ابن حزم نے دس خطوط کا ذکر کیا ہے جو دس بادشاہوں کے نام بھیجے گئے تھے اور ان میں سے چار نے اسلام قبول کر لیا تھا۔(۶۴) ابن ہشام نے تو نو افراد کی سفارتوں کا ذکر کیا ہے۔

## عہد نبویؐ کے دو مشہور سیاسی و معاشرتی ادارے (عرافہ اور نقابہ)

عہد جاہلیہ کے سماجی اداروں میں ''عرافہ اور نقابہ'' قدیم ادارے تھے اور عرب معاشرہ میں بہت اہمیت رکھتے تھے، یہ حکومت اور عوام میں واسطہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اپنے حلقے کے سیاسی و سماجی حالات سے حکومت کو آگاہ کرنا ان کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی مزید آبیاری کی۔ ایسے اداروں میں عرافہ اور نقابہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

عریف ایک چھوٹے حلقے کا نمائندہ ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ میں دس دس افراد پر ایک عریف مقرر ہوتا تھا۔ قبیلہ میں ذہین، تجربہ کار اور مالدار شخص کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ عہد نبوی میں اس ادارے کے وجود کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔(۶۵)

فتح مکہ کے بعد شوال ۸ھ میں جنگ حنین ہوئی۔ اس میں قبیلہ ہوازن وثقیف کے بہت سے لوگ جنگی قیدی ہو گئے تھے۔ اختتام جنگ کے بعد قبیلہ ہوازن کے لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے قیدیوں کی رہائی کے لیے درخواست کی، رسول اکرم ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ میں ان قیدیوں کو واپس کرنا چاہتا ہوں، تم میں سے جو شخص خوشی سے بزاد کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ لوگوں نے کہا ہم بخوشی آزاد کرتے ہیں، مگر آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو دیکھتے ہوئے فرمایا کہ مجھے نہیں معلوم تم میں سے کون بخوشی اجازت دیتا ہے اور کون نہیں، لہذا تم لوگ اپنے عریفوں کے ذریعے اس معاملے کو پیش کرو۔

یہ واقعہ فتح مکہ کے بعد کا ہے جب ریاست پوری طرح وجود میں آ چکی تھی۔ چنانچہ اس واقعہ سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ بنحضرت ﷺ نے اس سیاسی و سماجی ادارے کو باقی رکھا اور ان کے عرفاء کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کیا۔

### نقابہ

عریف کا دائرہ کار محدود ہوتا تھا۔ وہ اپنے محلے یا علاقے کے افراد کے حقوق و فرائض کی نگہبانی کرتا تھا۔ اس کے برعکس نقیب کی ذمہ داریاں زیادہ وسیع ہوتی تھیں۔ وہ ملک اور قومی سطح پر نمائندگی کرتا تھا۔

اسلام کی سیاسی تاریخ میں بیعت عقبہ کو جو بنیادی اہمیت حاصل ہے، سیاسیات کا ہر طالبعلم اس سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس موقعہ پر اہل مدینہ کے ساتھ ایک معاہدہ طے پایا جو قبیلہ خزرج سے تھے اور تین قبیلہ اوس سے

ان تمام نقباء کو حضور ﷺ نے خود نامزد نہیں فرمایا تھا بلکہ تمام نام انصار کی جانب سے پیش کیے گئے تھے۔
نبی اکرم ﷺ نے انصار سے تکمیل بیعت کے بعد فرمایا تھا:

**اخرجو لی منکم اثنی عشر نقیبا لیکونوا علی قومهم بما فیهم فاخرجوا منهم عشر نقیبا، تسعة من الخزرج، وثلاثة من الاوس.(٦٦)**

تم لوگ اپنے میں سے بارہ افراد پیش کرو، جو اپنے قبیلوں اور قوموں میں نقیب کے فرائض انجام دی گے تا کہ ان میں باہمی اختلاف کی صورت میں یہ لوگ حکم ہوں، چنانچہ انہوں نے بارہ افراد کا انتخاب کیا۔نو خزرج میں سے تھے اور تین قبیلہ اوس میں سے تھے۔

حضرت عبادہ بن صامت جو ان بارہ نقیبوں میں سے تھے۔اس واقعہ کو بڑی مسرت سے بیان کرتے ہیں۔
''مسلم''میں ان کی روایت ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

**"عن عبادة بن الصامت قال: انی من النقباء الذین بایعوا رسول اللّٰه ﷺ، وقال بایعناه علی ان لا نشرک باللّٰه شیئا ولا نسرق ولا نقتل النفس التی حرّم اللّٰه الا بالحق ولا ننتهب ولا نعصی، فالجنة ان فعلنا ذالک، فان غشینا من ذالک شیئا کان قضاء ذالک الی اللّٰه تعالیٰ".(٦٧)**

حضرت عبادہ بن الصامت فرماتے ہیں کہ میں ان نقیبوں میں سے ہوں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، نہ چوری کریں گے، نہ کسی کو ناحق قتل کریں گے، نہ لوٹ مار کریں گے، نہ نافرمانی کریں گے، اگر ہم نے اس عہد پر عمل کیا تو جنت میں جائیں گے اور اگر ان میں سے کسی برائی پر عمل کیا تو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔
آنحضرت ﷺ کے مقرر کردہ نقباء کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ حضرت سعد بن زرارہ
۲۔ حضرت اسید بن حضیر
۳۔ حضرت ابو جابر عبداللہ بن عمرو
۴۔ حضرت براء بن معرور
۵۔ حضرت رافع بن مالک

۶۔ حضرت رفاء بن عبدالمنذر

۷۔ حضرت سعد بن الربیع

۸۔ حضرت سعد بن عبادہ

۹۔ حضرت سعد بن خثیمہ

۱۰۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ

۱۱۔ حضرت عبادہ بن الصامت

۱۲۔ حضرت منذر بن عمرو

آنحضرت ﷺ نے صرف نقیبوں کا تقرر نہیں فرمایا بلکہ نقیب النقباء کا عہدہ بھی متعین کیا اور اس منصب پر حضرت سعد بن زرارہ کو مقرر فرمایا تھا۔ بلاذری، سعد بن زرارہ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''سعد بن زرارہ قبیلہ بنونجار میں سے تھے، ان کی کنیت ابوامامہ تھی۔ ہجرت نبوی کے نویں ماہ ان کا انتقال ہوا۔ اس زمانے میں مسجد نبوی تعمیر ہو رہی تھی۔ انہیں بقیع کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ یہ نقیب النقباء تھے۔(۶۸)

اس مختصر بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ زمانہ جاہلیت کے یہ دو قدیم ادارے علاوہ ازیں حلف اور ولاء اپنی پوری اسپرٹ کے ساتھ عہد نبوی میں بھی کام کرتے رہے۔

## اسلام کی سیاسی تعلیمات اور عہد نبویؐ میں ان کا نفاذ

یہ بات تو بدیہیات میں سے ہے کہ اسلام ایک منظّم معاشرہ کا قیام چاہتا ہے۔ جہاں ایک مستقل حکومت ہو، حاکم بھی ہو، محکوم بھی اور ہر ایک کے حقوق و فرائض متعین ہوں اور دائرہ کار واضح ہو۔ اس ضمن میں یہ ضروری تھا کہ قرآن و حدیث میں صراحت کے ساتھ ایسے احکام موجود ہوں جو امور ملکی کی تنظیم و تنسیق اور حکومتی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے براہ راست تعلق رکھتے ہوں۔

چنانچہ جب ہم قرآن و سنت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بنیادی سیاسی اصول پوری طرح روشن نظر آتے ہیں جن کی روشنی میں کسی ریاست کی بنیادوں کو مستحکم کیا جا سکتا ہے، اور پھر اسلام کا یہ اعجاز پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے کہ اس نے صرف خوبصورت و دلکش اصول پیش کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان پاکیزہ اصولوں کو، ہم عہد نبویؐ میں عملی صورت میں بھی دیکھتے ہیں۔ زیر نظر سطور میں یہی حقیقت بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جیسا کہ گزشتہ

صفحات میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کا پہلا بنیادی تصور اقتدار اعلیٰ کا تصور ہے۔

## حاکمیت الٰہی

اسلام نے ہمیں اس بنیادی فکر سے نوازا کہ حاکم مطلق اور آمر حقیقی صرف اللہ رب العالمین ہے، انسان اس کا انتظامی نائب ہے۔ لہذا کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو محکوم بنا کر اپنا بندہ بنائے۔ وہ مالک نہیں منتظم ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلاَّلِلّٰه﴾(۶۹)

﴿مَالِکُ الْمُلْکُ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءَ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاء﴾(۷۰)

﴿اَلَا لَهُ الْحُکْم﴾(۷۱)

اسی طرح کی متعدد آیات ہیں جن میں حاکمیت الٰہی کے عقیدہ کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اب جب ہم آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ کی زندگی ان تعلیمات کی تفسیر نظر آتی ہے، آپ کا کوئی فیصلہ اللہ جل شانہ کی مرضی کے خلاف نہیں۔ آپ نے عزت وذلت کا مرقع اسی کی ذات کو جانا اور آپ کا یہ ارشاد:

> ''میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دو پھر بھی حق بات کہنے سے باز نہیں آؤں گا''۔

اس عقیدے کا مظہر ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام کا دوسرا بنیادی ستون رسالت ہے۔

## ریاست

آنحضرت ﷺ کے فرمودات اور آپ کی سنت کو اسلام کے دیگر شعبوں میں جس طرح بنیادی اہمیت حاصل ہے بعینہ وہی درجات سیاست میں بھی حاصل ہے۔ اطیعوا اللہ کے ساتھ اطیعوا الرسول کا حکم اسی عقیدے کی وضاحت ہے کہ قرآن کے بعد سب سے بڑی اتھارٹی آنحضرت ﷺ کی ذات ہے۔ کسی پارلیمنٹ، اسمبلی، کسی جمہور کے فیصلے کو قرآن وسنت کے مقابلے میں کوئی قانونی حیثیت حاصل نہیں۔ حضرت معاذؓ بن جبل والی حدیث (۷۲)

میں آنحضرت ﷺ نے خود اس بات کی توثیق فرمائی کہ کتاب اللہ کے بعد دوسرا بڑا مآخذ قانون و ہدایت آنحضرت ﷺ کے ارشادات ہیں۔

## اوالوالامر

اولوالامر میں انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ تینوں شعبے داخل ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ اور رسول کے بعد اطاعت امیر کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے امیر کی اطاعت سے سرمو انحراف کی گنجائش نہیں۔

﴿وَ اطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ﴾(۷۳)

ارشاد ربانی واضح دلیل ہے۔

## شوریٰ

یہ وہ بنیادی ادارہ ہے جس کو اسلام کے سیاسی نظام میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ﴿وَاَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ﴾ کے ارشاد کی روشنی میں آنحضرت ﷺ نے اہم ترین فیصلے کرتے ہوئے شوریٰ کا طریقہ اختیار فرمایا۔

جنگ بدر کے قیدیوں کا مسئلہ ہو، یا اذان کا (ان شوریٰ کے واقعات کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے) آنحضرت ﷺ نے مشورہ کو بہت اہمیت دی ہے۔

## عدل وانصاف

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَنۡ لَّا تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا ھُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی﴾(۷۴)

اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو، یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

> ''تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ اس لیے تباہ ہوئیں کہ وہ لوگ کم تر درجہ کے مجرموں کو قانون کے مطابق سزا دیتے اور اونچے درجے والوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

قرآن وحدیث کی ان تعلیمات کی روشنی میں جب ہم عہد نبویؐ پر نگاہ ڈالتے ہیں، تو عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا ہوتے دیکھ کر غیر مسلم بھی آنحضرت ﷺ کے پاس انصاف طلب کرنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔

## شخصی آزادی

جس شخصی آزادی کا عصر حاضر میں ڈھنڈورہ پیٹا جاتا ہے اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ فرد کو جبر واستحصال سے آزادی اور اپنی رائے کے آزادانہ استعمال کا حق آج کے دور کا کارنامہ ہے۔ حقیقتاً اگر آج سے کم وبیش پندرہ سو سال پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھیں تو شخصی آزادی کے جو مناظر وہاں سامنے آتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ عرب جاہلیہ کے معاشرے میں پائی جانے والی تفریقات کے سبب کمزور سے بولنے کا اپنی رائے کے آزادانہ استعمال کا جو حق چھین لیا گیا تھا، آنحضرت ﷺ نے ان حالات میں انقلاب برپا کر دیا۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کرنے پر انصار کا اظہار رائے آنحضرت ﷺ کی عطا کردہ آزادی کا نتیجہ تھا۔ بھری مجلس میں آپ سے بدلہ طلب کرنا عہد نبوی میں دی گئی شخصی آزادی کا مظہر ہے۔

جنگ احد میں رسول کریم ﷺ اور ممتاز صحابہ کرام کی یہ رائے تھی کہ مدینہ میں رہ کر دفاع کیا جائے ورنہ شکست کا ڈر ہے، لیکن ساتھیوں کی اکثریت کی رائے اس کے حق میں نہ تھی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ سے باہر تشریف لے آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ جنگ کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ دفاع کے بارے میں رسول کریم ﷺ اور صحابہ کی رائے ہی درست تھی لیکن رسول اللہ ﷺ نے جنگ کے بعد اپنے کسی ساتھی سے یہ نہیں فرمایا کہ تمہاری وجہ سے جنگ کا فیصلہ ہمارے حق میں نہیں ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک سے دو باتوں کا صاف طور پر پتہ چلتا ہے:

۱۔ مسلمان سیاسی اور اجتماعی امور میں آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے لیکن جن باتوں میں وحی الٰہی نے کوئی فیصلہ دیا ہو وہ آخری فیصلہ شمار ہوتا تھا۔

۲۔ عقیدے میں آدمی کی رائے کا احترام کیا گیا چنانچہ نصاریٰ اور یہود اپنے عقیدے پر قائم رہے اور اپنی مذہبی رسومات کو آزادی کے ساتھ بجالاتے تھے۔ میثاق مدینہ جو ایک خالص سیاسی معاہدہ ہے، اس معاہدے میں جو مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین ہوا، یہ طے پایا:

ا۔ پیغمبر اسلام نے مدینہ منورہ کی جو شہری ریاست بنائی ہے، مسلمان اور یہود دونوں اس کے شہری ہیں۔

۲۔ دونوں مدینہ منورہ کی پاک اور مقدس سرزمین کا مشترکہ دفاع کریں گے۔

۳۔ دونوں فریق کو مکمل طور پر اپنے اپنے مذہب کی آزادی حاصل ہوگی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عرب جاہلیہ کا یہ رواج تھا کہ اگر یہودی یا کھیتی باڑی کرنے والا عرب شہری قتل ہو جاتا تو اس کا خون بہا سپاہیانہ زندگی بسر کرنے والے عرب سے کم ہوتا، لیکن رسول اکرم ﷺ نے اپنے سیاسی معاہدے میں یہودیوں کے سیاسی مرتبہ کو مسلمانوں کے برابر قرار دیا۔

علاوہ ازیں شخصی آزادی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کسی شخص کے معاملات میں تجسس نہ کیا جائے، سو اس ضمن میں بھی آنحضرت ﷺ کا واضح ارشاد موجود ہے۔

''مقدم بن معدیکرب اور ابوامامہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا، امیر جب لوگوں کے اندر شبہات تلاش کرے تو ان کو بگاڑ دیتا ہے۔(۷۵)

میثاق مدینہ رائے اور مسلک کی آزادی کا بہترین نمونہ ہے، اس کے علاوہ پورا خطبہ حجۃ الوداع انسانی حقوق کے تحفظ کا چارٹر ہے۔

## معاہدات کی پابندی

﴿اَوْفُوا بِالْعَهْدِ﴾ کا قرآنی حکم افراد کے باہمی معاہدوں اور اقوام کے باہمی معاہدات دونوں کو محیط ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس حکم قرآنی پر بھی عمل کا کمال نمونہ پیش کیا، ابھی عہد نامہ حدیبیہ پر دستخط بھی نہیں ہوئے تھے کہ معاہدہ کو نبھانے کا وقت آ پہنچا۔ ابن سہیل بن عمرو، زخموں سے چور، خون سے تر بتر پابہ زنجیر بارگاہ رسالت میں آ پہنچا اور آپ نے ڈوبتے دل اور ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ ابن سہیل بن عمرو کو سفیر قریش کے سپرد کر دیا کہ شرائط صلح میں یہ اصول طے پا چکا تھا۔(۷۶)

## عرب شاہلیہ کے صاحب عزت افراد

سیاسی طور پر یہ امر نہایت اہمیت کا حامل تھا کہ وہ لوگ جو عہد جاہلیہ میں سیاسی یا سماجی طور پر بلند مقام اور منصب رکھتے تھے، اسلام لانے کے بعد ان سے کیا سلوک کیا جائے اور انہیں کس مقام و مرتبہ پر رکھا جائے، چنانچہ اس ضمن میں آنحضرت ﷺ کی واضح ہدایت موجود ہے، ارشاد رسالت مآب ﷺ ہے۔

''خیارهم فی الجاهلیة خیارهم فی الاسلام''

اب اس حدیث طیبہ میں دیئے گئے اصول پر آپؐ نے مختلف مواقع پر عملی ثبوت فراہم فرمایا۔ مثلاً فتح مکہ کے موقع پر مکہ کے حکمرانوں عتاب بن اسید کے اسلام لانے پر مکہ کی گورنری انہی کے سپرد فرمائی (۷۷)۔

آیت کریمہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدّوا الْأَمَانَاتِ اِلَى اَهْلِهَا.....الخ﴾ کے تحت ابن جریر یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ:

> ''یہ آیت حضرت عثمان بن طلحہ کے بارے میں ہے۔ بیت اللہ کی کنجی برداری کا منصب ان کے خاندان کے پاس تھا، فتح مکہ کے موقعہ پر چونکہ یہ مسلمان ہو چکے تھے اور اس کام کا ان کو سابقہ تجربہ بھی تھا۔ رسول اللہؐ نے ان سے کنجی لے کر بیت اللہ کا دروازہ کھولا، اندر تشریف لے گئے باہر تشریف لائے اور آپ کی زبان پر یہ آیۃ کریمہ تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے عثمان بن طلحہ کو بلایا اور بیت اللہ کی کنجی ان کے حوالے کردی'' (۷۸)۔

عہد نبویؐ کے اسی سیاسی نظام کا یہ وہ مختصر سا خاکہ ہے جس کی مستحکم بنیادوں پر آئندہ اسلام کی وسیع ترین اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ جس نے امور جہانبانی کو نئی جہتیں دیں، تہذیب وتمدن کے نئے چراغ روشن کئے۔ عدل وانصاف کے اعلیٰ معیارات قائم کئے، اور دنیا کی نقشے پر ایک ایسی عظیم ریاست وجود میں آئی جو اپنی مثال آپ تھی۔

## حواشی وحوالہ جات

۱۔ القرآن۔ النور: ۵۵

۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی ص ۷۵

۳۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی ص ۷۵

۴۔ سید شمیم حسین قادری، اسلامی ریاست قرآن وسنت کی روشنی میں (مطبوعہ علماء اکیڈمی، لاہور، جون ۱۹۷۴ء) ص ۱۵

۵۔ نکلسن، لٹریری ہسٹری آف عربز (عربوں کی ادبی تاریخ) ص ۱۷۳

۶۔ حسن ابراہیم حسن، مسلمانوں کا نظم مملکت، مترجم مولوی عبداللہ صدیقی (دارالاشاعت کراچی، س، ن) ص ۲۰

۷۔ ''مواخات''، یعنی بھائی چارے کی بنیاد ڈالی۔ اور یہی وہ حکیمانہ طرز عمل تھا جس نے مہاجر ومقیم کے فرق کو مٹا کر انہیں باہم شیر وشکر کردیا۔

۸۔ بخاری، الجامع الصحیح، ج۵، ص۸۸

۹۔ ایضاً

۱۰۔ مناظر احسن گیلانی، النبی الخاتم، ص۹۱

۱۱۔ محمود شیت خطاب، الرسول القائد، (دار المکتبہ الاحیاء، بغداد۔۱۹۶۰ء)، ص۵

۱۲۔ القرآن۔الانعام۔۱۵۱

۱۳۔ مسلم، کتاب الایمان باب بیان الکبائر واکبرھا، ج۱، ص۶۴

۱۴۔ مسند احمد، ج۲، ص۹۴

۱۵۔ الرسول القائد، ص۱۹

۱۶۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رسول اکرم کی سیاسی زندگی، (دار الاشاعت، کراچی۔۱۹۸۴ء)، ص۱۱۴

۱۷۔ ابن حجر، فتح الباری، جلد۷، ص۴۰۱

۱۸۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ج۲، ص۶۷۷

۱۹۔ ابن ہشام، ج۴، ص۸۴

۲۰۔ علامہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، ج۱، ص۱۹۲

۲۱۔ علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، ج۱، ص۴۹۱

۲۲۔ بخاری ج۵، ص۱۹۴

۲۳۔ القرآن، ۹:۲۵۔۲۶

۲۴۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج۲، ص۱۷۱

۲۵۔ محمود احمد غازی، مقالات سیرت، (ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۸۱ء)، ص۱۶۳

۲۶۔ محمد بن علی بن طباطبائی ابن الطقطقی، الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیۃ، (المطبعۃ الرحمانیۃ۔مصر ۱۹۲۷ء) (الفصل ثانی) ص۵۲

۲۷۔ القرآن۔الزمر۔۶

۲۸۔ القرآن۔الاعرف۔۵۴

۲۹۔ غزالی۔التبر المسبوک فی نصائح الملوک (مطبوعہ جمالیہ مصر ۱۳۰۶ھ) ج دوم، ص۶۔۷

۳۰۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، سنت کی آئینی حیثیت، (مطبوعہ، اسلامک پبلیکیشنز، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور ۱۹۶۳ء)، ص ۳۱۔۳۲

۳۱۔ ابن خلدون، مقدمہ، ص ۱۵۳، ۱۵۴

۳۲۔ المسعودی، مروج الذھب، ج ۲، ص ۱۱

۳۳۔ حوالہ ایضا، ص ۱۹۱

۳۴۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، (اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۶۲ء)، ص ۱۹۸

۳۵۔ القرآن۔ النساء۔ ۵۹

۳۶۔ ابن جریر، تفسیر جامع البیان، ج ۵، ص ۱۴۷، ۱۵۰

۳۷۔ فخر الدین رازی، تفسیر کبیر، ج ۱۰، ص ۱۴۴

۳۸۔ بخاری، الجامع الصحیح، ج ۲، ص ۱۰۵۷

۳۹۔ جامع الاصول، ج ۴، ص ۶۲۔ ۶۳

۴۰۔ بخاری، الادب المفرد، ص ۵۳، محمد حسین ہیکل، ابوبکر الصدیق، (شرکہ مساہمہ مصر ۱۹۵۸ء) ص ۲۷

۴۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مطبوعہ لیدن، ص ۸۰

۴۲۔ ایضا

۴۳۔ القرآن۔ الشوریٰ۔ ۳۸

۴۴۔ ابوبکر جصاص، احکام القرآن، ج ۳ ص ۴۷۵

۴۵۔ فخر الدین رازی، تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۴۱۵

۴۶۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ج ۷، ص ۱۹۵

۴۷۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ص ۲۹۷

۴۸۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ج ۷، ص ۱۹۵

۴۹۔ القرآن۔ طہ۔ ۲۹

۵۰۔ محی السنہ ابی محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی، شرح السنہ، (طبع بیروت، ۱۹۷۱ء) ج ۱، ص ۲۱۴

۵۱۔ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، (دمشق ۱۹۶۱ء)، ص ۱۶۰

۵۲۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، (بیروت ۱۹۵۷ء)، ج ۲، ص ۲۵۷

۵۳۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، (طبع بیروت ۱۹۶۰ء)، ج ۲، ص ۱۹۲

۵۴۔ بخاری، الجامع الصحیح، ج ۲، ص ۱۰۷۸

۵۵۔ بخاری، الجامع الصحیح، ج ۲، ص ۶۶۲

۵۶۔ ابن حجر، فتح الباری، ج۱۶، ص۳۷۱

۵۷۔ بلاذری، فتوح البلدان، (طبع مصر ۱۰۰ء)، ص۷۶

۵۸۔ ابن اثیر، الکامل، ج۲، ص۳۰۱

۵۹۔ بخاری، الجامع الصحیح، ج۲، ص۸۷۲۔۸۷۳

۶۰۔ ایضا

۶۱۔ ابن قیم، زاد المعاد، ج۱، ص۴۸

۶۲۔ ابن عبدالبر القرطبی، الاستیعاب علی حاشیہ الاصابہ، ج۲، ص۸

۶۳۔ سیرت الحلبیہ، ج۳، ص۴۲۴

۶۴۔ ابن حزم، جوامع السیر، ص۲۹۔۳۰

۶۵۔ پروفیسر محمد یوسف فاروقی کا فکر ونظر میں عرافہ اور نقابہ پر ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا ہے۔ (فکر ونظر ج۱۹، شمارہ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

۶۶۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، بیعت عقبہ ثانیہ

۶۷۔ صحیح مسلم، ج۲، کتاب الحدود، ص۸۱

۶۸۔ بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ج۱، ص۲۴۳

۶۹۔ القرآن۔ الانعام۔ ۵۷

۷۰۔ القرآن۔ آل عمران۔ ۲۶

۷۱۔ القرآن۔ الانعام۔ ۶۲

۷۲۔ ابوداؤد، باب اجتہاد الرای فی القضاء، (مطبع مجتبائی، لاہور، ت ل)

۷۳۔ القرآن۔ النساء۔ ۵۹

۷۴۔ القرآن۔ المائدہ۔ ۸

۷۵۔ ابوداؤد، ج۴، ص۳۷۵

۷۶۔ ابن ہشام السیرۃ النبویہ، جلد دوم، ص۳۱۸ (طبع مصر)

۷۷۔ ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفی، (مطبوعہ تعلیمی پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۸۲ء) حصہ سوم، ص۷۸

۷۸۔ ابن جریر، الطبری، ج۵، ص۱۴۵